سودائی

★

دِل کی دُنیا

(ناول)

عصمت چغتائی

کتابی دُنیا - دہلی ۶

١۔ سودائی

٢۔ دل کی دنیا

ناول

عصمت چغتائی

کتابی دنیا

١٩٥٥، ترکمان گیٹ، دہلی ٦

سودائی

ناول

عصمت چغتائی

چندر زینے کی ریلنگ پر سے بر سر پھسلتا ہوا دھم سے نیچے آن کودا۔ روز کی طرح آج بھی ماسی کا کلیجہ منہ کو آگیا۔

"بدمعاش کہیں کا، جو ذرا پیر چوک جاوے تو ہڈی پسلی ایک ہو جاوے"۔ وہ سرپیٹ کر کہتیں، مگر چندر کہیں سننے والا تھا۔ وہ روز اسی طرح کچھوے کی طرح پھسلتا ہوا زینے سے اترا کرتا تھا اور ماسی کا دل یونہیں لوٹ پوٹ ہو جایا کرتا تھا۔

"ستیاناسے، ایک روج ایسا منہ کے بل گرے گا کہ سارے دانت ٹوٹ کر حلق پر جا پڑیں گے۔ میری تو کوئی بات نا سنے ہے"۔

چندر اپنا کھونڈا منہ سکیڑ کر ناک کی پھنگی سے ملا لیتا اور زور فوں کر کے ایک ٹانگ پر کودتا کھانے کی میز پر جھپٹا مارتا۔

ماسی کو ستانے میں اسے بڑا مزہ آتا تھا۔ ہمو کی بھی مٹی پلید کر رکھی تھی۔ وہ چندر سے سال ڈیڑھ سال چھوٹی تھی مگر سارے گھر میں بس اسی کو اپنا گرو مانتی تھی۔ اور کرتی بھی کیا! وہ اس کی ننھی ننھی چوٹیاں پکڑ کر گھسیٹتا، بات بے بات لنگڑی لگا کر گرا دیتا، اس کی گڑیوں کا بھرتا بنا ڈالتا اور جو جی میں آتا حکم دینے لگتا:

"ناک پکڑ کر سات سلام کر"۔

"ایک ٹانگ سے جا اور بھرا گلاس پانی کا لا! ایک بوند بھی گرائی تو بس کٹی"۔

اور کٹی کے معنی تھے آتے جاتے دھول، کبھی کہنی مار دی کبھی ناک دبا دی۔ تجربے نے سکھا دیا تھا کہ چندر اس کے بس کا روگ نہیں۔ وہ صرف بڑے بھیا سے ڈرتا ہے۔ انہیں دنیا کا سب سے مہان، سب سے پیارا اور سب سے زیادہ بدھی وان سمجھتا ہے۔ بڑے بھیا ہیں بھی اس سے پورے پندرہ برس بڑے۔ وہ اتنے بلند، بلند اتنے دیالو اور اتنے نیک چلن تھے کہ بس! جبھی تو ان کا نام سورج تھا۔ اور چاند پر جب سورج کی چمک پڑتی ہے تب ہی تو چمکتا ہے۔ اگر سوریہ دیوتا روٹھ جائیں تو چندرما کا منہ کالا بھٹ پڑ جائے۔

جبھی تو ماسی روز صبح شام سورج کی آرتی اتارتی ہے کیونکہ وہ دیوتا ہے اور

چندر کو بھوت کہتی ہے- سورج نے آج تک کسی کو نہ مارا نہ ستایا نہ جھوٹ بولا نہ چوری کی نہ گلی کے لونڈوں کے ساتھ گلی ڈنڈا اور کبڈی کھیلی اس کی ماں جانتی تھی کہ آس پاس کوئی لونڈا بھی سورج کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے لائق نہیں- اس کے ساتھی انسان نہیں کہانیوں قصوں میں بسنے والے راج کمار اور سادھو سنت تھے-

ماسی ہر وقت اس کی تعریفوں کے گن گایا کرتی تھی- لوگوں کا خیال تھا وہ اپنی بیٹی اوشا سے سورج کا بیاہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے اس لئے اسے بہترین داماد بنانے میں جٹی رہتی ہے- ماسی نے اسے ایسا تعریفیں کر کے چڑھا دیا تھا کہ کبھی کوئی شرارت کرنے کو من بھی چاہتا تو وہ ڈر جاتا کہ کہیں اس کی ساکھ نہ ختم ہو جائے اور وہ بھی معمولی انسان سمجھا جانے لگے تب لوگ اس کی اتنی چرچا نہیں کریں گے' ماسی آرتی نہیں اتارے گی' چندر اور ہمو اس کے ڈر سے لرزنا چھوڑ دیں گے- پھر دنیا میں اس کے لئے کیا رہ جائے گا! عزت ہی تو ایک چیز ہے جو اسے اتنی سی عمر میں اتنی بہت سی ملی ہوئی ہے- وہ اپنے خزانے پر ڈاکا نہیں پڑنے دے گا- مرتے وقت ماتا جی نے چندر اور ہمو کا ہاتھ پکڑا کر کہا تھا:

"بیٹا اب تم ہی ان کے مائی باپ ہو- کوئی ایسی بیچ بات نہ کرنا جو یہ برا سبق پا کر آوارہ ہو جائیں- اگر خاندان کی عزت پر آنچ آئی تو میری آتما کو چین نہ آئے گا"-

پتا جی سال بھر پہلے ہی پر لوک سدھار چکے تھے- انہوں نے دنیا کے بنائے اصولوں کو ٹھکرایا اور ایک نیچ عورت کے چکر میں پڑ کر ہلکان ہوئے- پھر اسی سے جھگڑا ہونے کے بعد شراب میں دھت ہو گئے اور موٹر کے ایکسیڈنٹ میں ختم ہو گئے-

ماسی ماں جی کی بڑی پیاری سہیلی تھیں- ان کے پتی نے بھی انہیں چھوڑ رکھا تھا اور دو دکھی عورتیں ہر وقت سورج کے کانوں میں نیک چلنی کا سندیس انڈیلا کرتی تھیں-

ماسی کا خیال تھا سورج کے پتا' تربھون ناتھ جی' کی اچھی طرح دیکھ ریکھ نہیں ہوئی- ادھر ان کے ماں باپ نے ڈھیل دی ادھر پتنی بے دم نکل گئی اور کبھی پکی طرح ان کی روک تھام نہ کر سکی' تب ہی وہ جوانی میں بے موت مرے- سورج پندرہ برس اکلوتا لاڈلا بیٹا رہا- اور پتی کی بے توجہی سے ڈر کر ماں نے بیٹے پر ہی پنجے گاڑ دیئے- پھر کچھ نصیب پھرے اور دو بچے اور ہوئے مگر سورج جیسا پیار کسی کو نہ

ملا- چندر اور ہمو کو نوکروں نے پالا-

بری راہ سے روکنے کے لئے صرف بھاشن جھاڑنے کو کافی نہ سمجھا گیا اور ماں نے اوشا رانی سے اس کی نسبت کر دی اور ماسی کے ساتھ مل کر وہ اوشا اور سورج کا میل بھاگوان بنانے پر جٹ گئیں مگر شادی کرنے سے پہلے ہی موت نے آلیا اور چل بسیں-

ماں مری تو ہمو ڈیڑھ برس کی تھی' چندر تین کا اور سورج کا اٹھارواں سال ختم ہو چکا تھا- اتنی سی عمر میں ایسی بھاری ذمہ داری سر پر آن پڑی تو وقت سے پہلے ہی سورج بوڑھا ہونا شروع ہو گیا- شریر تو کبھی نہ تھا' اب تو بالکل ہی سادھو بن گیا- اسکول کالج میں بڑے لڑکوں کی صحبت کے ڈر سے اسے گھر پر ہی ٹیوٹر رکھ کر تعلیم دلوائی گئی تھی- ماں کو مرے تین سال بیت چکے تھے مگر کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جب ماسی آنسو بہا کر اس کی موت کا نقشہ نہ کھینچتی ہو- دن میں کئی بار وہ ماں کے قول دہراتی تھی- چندر اور ہمو تو ماں کو بھول سے گئے تھے مگر سورج پر ماں اور ماں کے بعد ماسی کا بہت دباؤ تھا-

سورج کے ساتھ وہ اوشا پر بھی بڑی سخت نگرانی رکھتی- اسے ایک دن گھر کی ملکہ بننا تھا' اسے سورج کی یوگیہ بننا تھا- وہ اسے ہر وقت پڑھنے لکھنے اور کشیدہ کاری کے کام پر جتائے رکھتی- دودھ کا جلا چھاج پھونک پھونک کر پیتا ہے! یہ مرد کی ذات بندر جیسی ہوتی ہے- کتنا بھی پڑھاؤ سدھاؤ موقع ملے گا تو جھٹ پیڑ پر چڑھ جائے گا- اور اوشا کو وہ ایسے گر سکھانا چاہتی تھی کہ اس کا پتی پیڑ پر نہ چڑھ سکے' ناک کی سیدھ میں سچے راستے پر چلتا رہے- اوشا ماں کے مقابلے میں نری گائے تھی' جدھر ماں ہنکاتی انکھ جاتی-

ماسی حرام خور نہیں تھی- اس نے اپنی سہیلی کے پیار کو بڑے دل سے نبھایا- بیماری میں ایسی سیوا کی کہ سگی بہن کیا کرتی- سیاہ سفید کی مالک ہو کر بھی کبھی کچھ اٹھا بچا کر اپنے تن کو نہ لگایا- ہمیشہ گھر میں چار نوکروں کے برابر کام کیا- ویسے بینک اور جائیداد وکیل سیتا رام جی کے ہاتھ میں تھی- سیتا رام جی بڑے دوست نواز' بھلے مانس برہمچاری تھے- ان تین بچوں کو اپنا سمجھ کر دیکھ بھال کرتے تھے- مگر سارا زیور کپڑا تو ماسی کے ہاتھ میں تھا- مرنے والی نے اپنے ہاتھ سے جو زیور دے دیا تھا اس کے علاوہ انہوں نے کبھی ایک تار بھی نہ چھوا اور ضرورت بھی کیا تھی! سارا زیور ماں سورج کی دلہن کے لئے دے گئی تھی- چندر اور ہمو جب بڑے ہوں گے

تب دیکھا جائے گا۔ سورج سب دیکھ ریکھ کرے گا۔ سورج کی دلہن سوائے اوشا کے اور کون تھی! پھر کیا ضرورت تھی ماسی کو کسی چیز کی! سب کچھ ہی تو اوشا کے لئے تھا۔ چھوٹی سی عمر سے ہی اوشا نے سورج کو اپنے من مندر کا دیوتا مان لیا تھا۔ بارہ تیرہ برس کی عمر سے وہ باشعور بیوی کی طرح ہر بات کا خیال رکھتی۔ بغیر ماسی کے ٹوکے وہ ان کے لئے پانی گرم کروا کر حمام میں لگواتی' ان کے کپڑے نکال کر سجاتی کھانے کے وقت ان کی تھالی میں مزے دار لقمے پروستی بابنا مانگے اسے پتہ چل جاتا کہ انہیں نمک چاہئے' پانی چاہئے یا ہری ہری مرچ کو دل ہو رہا ہے۔ وہ ان کے لئے چکن کے کرتے کاڑھتی' نئی نئی وضع کے سویٹر بنتی اور رومال پر گلدستے کاڑھتی گھر اسی کا تو تھا نا۔ ذرا سی کوئی چیز ٹوٹ جاتی یا ادھر کی ادھر ہو جاتی تو وہ گھر ستنوں کی طرح نوکروں سے جھگڑا کرتی۔

سورج اس کی سیوا کے عادی ہو چکے تھے اور اسے اپنا حق سمجھ کر سوئیکار کر لیا کرتے تھے۔ مگر عام نوجوانوں کی طرح انہوں نے نہ کبھی اوشا سے چھیڑ خانی کی اور نہ میٹھی آنکھ بھر کر دیکھا۔

"اسے لونڈھیار پن پسند نہیں۔ کوئی وہ لفنگا ہے؟ اور نہ میری بٹی حرافہ ہے"۔

کبھی کوئی سورج کی بے توجہی کی طرف اشارہ کرتا تو فوراً سمجھا دیتیں: "سورج اپنی ماں پر گیا ہے"۔

مگر چندر سوجا باپ پر گیا: بے چین' بے قرار اور خود سر۔ اس کا انجام بد ہو پر ہو۔ نہ بھی پیدا ہوتے تو ستونتی کی کوکھ تھوڑی جل جاتی۔ سو اولادوں کی ایک اولاد سورج موجود تھا۔ وقت آنے پر سب کچھ ہو رہے گا۔ ماسی کو اپنے سگھڑاپے پر پکا بھروسا تھا' انہیں معلوم تھا کہ موقعے اور ضرورت کو دیکھ وہ اوشا کو مرد پھانسنے کا گر بھی سکھا دیں گی ویسے انہوں نے کیا کسر اٹھا رکھی تھی ہر وقت لیکچر پلایا کرتیں:

"بٹی سیوا سے تو بھگوان بھی من جاتے ہیں' سورج تو پھر منش ہے"۔ خود ماسی نے اپنے میاں کی سیوا جی جان سے کبھی نہ کی۔ وہ نگوڑا اس کا جوگ تھا بھی نہیں۔ اگر وہ کلرک کے بجائے کوئی تھانے دار یا ڈپٹی ہوتا تو مجال تھی وہ ان کے چنگل سے نکل جاتا! ایسی سیوا کرتیں کہ ستی ساوتری کو طاق میں بٹھا دیتیں۔

مگر سورج تو اس قابل تھا کہ اوشا کی خوش نصیبی تھی جو اس جیسا پتی ملنے والا تھا۔ تبھی تو ماسی کے پروگرام کے مطابق اس کے پاس ہر وقت اوشا ہی نظر آتی تھی۔ جسے دیکھے گا انسان اسی کو تو پرکھے گا!

چندر حسب معمول چھلانگیں مارتا' فرنیچر پر سے کودتا سیدھے ناشتے کی میز پر ٹوٹا۔

"ہائیں ہائیں..... چندر!" ماسی چلائی۔

"کیا ہے ماسی؟"

"کہاں بیٹھا ہے رے؟"

"کرسی پر ماسی"۔

"کس کی کرسی پر بیٹھا ہے رے!"

"اوہ! بڑے بھیا کی کرسی پر!" جھٹ سے وہ کرسی چھوڑ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا' جیسے اس نے مندر میں کسی دیوتا کا آسن گندہ کر دیا ہو۔

ماسی نے ادب سے زینے کی اور دیکھا' جدھر سے سوریہ دیوتا پدھارنے والے تھے۔

"ہائیں چندر......" ماسی نے اسے پھلوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھ کر ہانک لگائی۔

"بڑے سرکار کو تو آ لینے دے نگوڑے! کیسا ندیدہ ہے' رام رام!"۔

باادب باملاحظہ ہوشیار!

مہابلی تشریف لاتے ہیں۔

فضا ان کے رعب سے لرز اٹھی۔ آنکھ کا اشارہ پاتے ہی اوشا لپک کر پچھلی سیڑھی کے قریب سر پر اوڑھنی ڈال کر کٹھ پتلی کی طرح جا کھڑی ہوئی زینے کے موڑ سے پہلے دھیرے دھیرے قدموں کی چاپ پدھاری' پھر جیسے پچھم کی سیما سے سوریہ دیوتا نے سر اٹھایا:

بڑی بڑی تپسویوں جیسی گمبھیر آنکھیں باگھنے بال جن کی ایک پتلی لٹ ماتھے پر لرزتی ہوئی باستواں کھڑی ناک با جھاگ سی سفید دھوتی با بھاری ریشم کا ڈھیلا کرتا' کاندھوں پر بھونسلے رنگ کے پشمنے کی شال سنبھالے پل بھر کو زینے کی چوٹی پر جگمگائے۔ یہ لباس انہوں نے بنگالیوں سے پہننا سیکھا تھا۔

پھر قدم تولتے' ٹپ ٹپ کرتے وہ نیچے اترنے لگے۔

"نمسکار!" اوشا کی نازک سی آواز سرسرائی۔

"نمسکار!" انہوں نے دور ہوا میں دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر گری ہوئی لٹ کو چھو لیا۔

"جیو میرے لال! ہزاری عمر ہووے"۔ ماسی نے چٹ چٹ بلائیں لینا چاہیں مگر وہ کاوا کاٹ کر بچ گئے تاکہ ماسی ان کے ماتھے کی لٹ نہ بگاڑ دیں۔ جو انہوں نے بڑی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر سجائی تھی' جو بالکل ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے لاپرواہی کی وجہ سے آن پڑی ہو۔

اور ماسی روز اس مشکل سے جمائی ہوئی لٹ کو سنوارنے کی دھمکی دیا کرتی تھی جس پر انہیں غصہ آنے لگتا تھا مگر ضبط کر جایا کرتے تھے کہ دیوتا غصہ نہیں کیا کرتے۔

چندر کا بھوک کے مارے حال پتلا ہو رہا تھا' جیسے ہی بڑے سرکار بیٹھے وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

تب چڑیا کی طرح پھدکتی ہوئی ہمو آئی اور آتے ہی چندر کا منہ چڑایا اور دھم سے بیٹھ گئی۔

"ہمو رانی"۔

"جی؟"

"آج تو نے کیا نہیں کیا؟"

"ہا.... آ.... ں......"

"اچھا تو پہلے نمسکار کر"۔ ماسی حکم دیتی اور ہمو نے نمسکار کر کے چندر کی نقل میں ھکسنا شروع کر دیا۔

ماسی نے جھٹ سے لڈوؤں کی پلیٹ اٹھا کر سورج کے آگے رکھ دی۔

"پہلے بڑے بھیا کو لینے دے۔ بیٹا میں ابھی تازی پوری تل کر لاتی ہوں ان نوکروں کا کچھ بھروسہ نہیں' کچی پکی بنا ڈالیں گے۔ روز تو اوشا بناتی ہیں۔ لو بٹی تم بڑے سرکار کے لئے اتار پھلو"۔

ہونے والے رشتے کا حساب لگا کر وہ اوشا کو بڑے بھیا نہیں کہنے دیتی تھی۔

"مگر آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں' کیا سارے نوکر مر گئے ہیں؟"

"ارے واہ بیٹا' اس میں تکلیف کیسی! ہائے' تم میرا کتنا خیال رکھتے ہو! میرے لال' ستی ساوتری تمہاری ماں نے جو سہارا نہ دیا ہوتا تو ہمارا کیا بنتا؟" ماسی فوراً بسور کر رونے لگیں۔ انہیں روتا دیکھ کر چندر اور ہمو کو بے حد خوشی ہوتی تھی' دونوں کھوں کھوں ہنسنے لگے۔

"اے لو بیٹے یہ نارنگیاں"۔ چندر کو نارنگیوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھ کر

ایک دم انہوں نے آنسوؤں کا نل بند کر دیا اور مسکرانے لگیں۔

نہیں' رات کو ڈھوں ڈھوں کھانسے گا"۔ انہوں نے چندر کا ہاتھ جھٹک دیا۔

روتے روتے جب وہ یوں ایک دم بریک لگا کر گیئر بدلتیں تو بڑے سرکار کی ناک بھی پھڑکنے لگتی اور وہ ہنسی چھپانے کے لئے فوراً رومال سے ناک دبوچ لیتے۔ وہ بھلا کیسے ہنس سکتے تھے!

ماسی پوریاں لینے گئی' اوشا ہمو کے جوتے کی گھنڈیاں ٹھیک کر رہی تھی اور چندر میز کے نیچے جھکا ہوا ٹامی کو بسکٹ کھلا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میدان خالی تھا۔ سامنے تازہ لڈو مہک مار رہے تھے۔ بڑے سرکار کے من میں چھپا ہوا شریر بچہ ایک دم ہمکا اور غڑاپ سے لڈو منہ میں ماسی کے پیروں کی چاپ سن کر ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ لڈو کو کیا کریں۔ نہ منہ تک لے جانے کا موقع تھا نہ واپس پلیٹ میں پہنچ سکتا تھا' مجبوراً کرتے کی جیب میں سٹکا لیا۔

"ہائیں .... چندر!" ایک دم لڈو غائب دیکھ کر ماسی نے چھاتی کوٹ لی' "کیوں رے پاجی! ڈاکٹر نے مٹھائی کھانے کو منع کیا ہے اور تو ایک دم دو لڈو کھا گیا؟"

"ہم نے نہیں کھائے لڈو"۔ چندر منمنایا۔

"اور اوپر سے جھوٹ بولتا ہے بے ایمان۔ دکھا ہاتھ"۔

"چندر نے دونوں ہاتھ ماسی کی ناک کے پاس کر دیئے۔ وہ بدک کر دور ہٹ گئیں۔

"منہ کھول"۔

چندر نے منہ کھولا۔ غور سے لڈوؤں کے نشانات ڈھونڈنے کے بعد فیصلہ کیا کہ "سوچے ہی نگل گیا' چور"۔ انہوں نے اس کے کان پکڑ لئے۔

"بس بس ماسی' غلطی ہوئی' معاف کر دیجئے۔ اب ایسا نہیں کرے گا۔" بڑے سرکار بولے۔

"بے کار ہمارا نام لے رہی ہے۔ ماسی۔ ہم نے لڈو چھوئے بھی نہیں"۔

"تو پھر ہمو نے کھائے ہوں گے"۔ بڑے سرکار نے ہمو کو گھورا۔

"نہیں بڑو بھیا' ہم نے تو کھائے بھی نہیں۔ اوشا دیدی سے پوچھ لیجئے"۔

"یقیناً اوشا رانی نے تو نہیں کھائے۔ تو پھر کہاں گئے لڈو؟" بڑے سرکار نے بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے چندر کو گھورا تو اس نے سہم کر نظریں نیچی کر لیں۔

"یہ دیکھو بغلیں جھانکنے لگا گوڑا۔ چھی چھی کتنا گندہ بچہ ہے ـــــ لو بیٹا تم تو کھاؤ"۔

ماسی نے لڈو سورج کی طرف بڑھائے۔

"نہیں ماسی' آپ جانتی ہیں مجھے مٹھائی پسند نہیں"۔ بڑے سرکار نے جیب میں پڑے ہوئے لڈو کو پیار سے سہلا کر کہا' "چندر آئندہ تم نے ایسی نیچ حرکت کی تو ..... اچھا نہ ہو گا"۔

ناشتہ کرتے ہی ہیمو اور چندر میں اشاروں ہی اشاروں میں باتیں ہوئیں دونوں کھسک لئے۔ ماسی اور اوشا نے گھر کے حساب کتاب کی فہرست نکال لی۔

"پودینہ تین آنے .... لوکا چھ آنے .... توری ...."

ماسی اپنی ایمانداری کی ساکھ بٹھانے کے لئے دانے دانے کا حساب دیا کرتی تھی تاکہ بڑے سرکار قائل ہو جائیں کہ ہونے والا رشتہ کتنا منافع بخش ہو گا مگر بڑے سرکار کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ان کا منہ نوچ لیں۔

"ادرک ڈیڑھ پاؤ .... گرم مصالحہ ...."

"اوہ ...." بڑے سرکار نے بڑے ڈرامائی انداز میں اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا' ماسی اچک پڑی۔

"اے ہے' کیا ہوا بیٹے"۔

"درد .... سر میں درد ...."

"اری اوشا' کیا بگیوں کی طرح کھڑی منہ تک رہی ہے' منشی جی سے کہہ۔"

"نہیں' ڈاکٹر صاحب کو نہ بلوائیے۔ میری دراز میں گولیوں کی شیشی ہے"۔

"اری جا نصیبوں جلی"۔ انہوں نے اوشا کو دھکا دیا اور خود آنچل سے ہوا کرنے لگی۔

"پا .... پانی" بڑے سرکار نے سر پٹخ کر کہا۔ ماسی پانی لینے بھاگی انہوں نے اطمینان سے لڈو جیب سے نکالا' زیادہ نظر جھاڑی اور گپ سے منہ میں ڈال لیا اور بڑے آنند سے آنکھیں موند کر مزے لینے لگے۔

جب ماسی ہانپتی کانپتی پانی کا گلاس لئے دوڑی آئیں اور اوشا گولیوں کی شیشی لے کر ان کے پاس پہنچی تو انہوں نے چونک کر دونوں کو ایسے دیکھا گویا پہچانتے تک نہیں۔

"ہ سر کا درد .... گولی .... پانی ....!" ماسی یاد دلانا چاہتی۔

"پانی؟ گولی؟ ہاں سمجھا۔ نہیں اب ضرورت نہیں"۔

اور وہ بڑی بے توجہی سے اخبار دیکھنے لگتے۔ ماں بیٹیاں کچھ بھونچکی سی رہ جاتیں۔ بڑے سرکار کی سیوا کا اتنا حسین موقع ہاتھ سے جانے کا بھی ملال ہوتا۔

بڑے سرکار کو یوں الو بنانے میں بڑا لطف آتا۔ وہ کتنے بدھی وان تھے جسے چاہتے دم بھر میں الو بنا کے رکھ دیتے تھے اور پھر دیر تک یاد کر کے ہنسا کرتے اور بڑا آنند ملتا۔

"اور کیا' جی تو کہہ رہا ہوں۔ اگر ہتھنکیا سے بالشت بھر گہرا کھودا تو زمین سے بونا نکلے گا"۔ چندر نے بڑھا کی۔

"ہائے رام! چھٹ بھیا کیا پھر وہ میرے سنگ کھیلا کرے گا؟"

ہمو دے جی اپنی ننھی سی ہتھنکیا سے مٹی کھود رہی تھی' مگر زمین ایک انچ بھی نہیں کھدی تھی کہ ناخنوں میں مٹی بھر کر ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

"چھٹ بھیا جی"۔

"کیا؟"

"تم نے کبھی پری دیکھی ہے"۔

"بہت دفعہ"۔

"چل جھوٹے لپاٹی!"

"جی ..... تیری کسم"۔

"تو ہمیں بھی دکھاؤ نا"۔

"تو بدھو ہے' تجھے پری نہیں دکھائی پڑے گی"۔

"کیوں؟"

"بس کہہ دیا ہم نے"۔

"چھٹ بھیا"۔

"کیا ہے"۔

"انگلی دکھ رہی ہے"۔

"کہا تھا تجھ سے نہیں کھودی جائے گی زمین"۔

"ہنک! بھیا جی پری"۔

"اچھا ..... وہ دیکھ"۔

"کہاں؟" ہمو ڈر کر پاس گھس آئی۔

"وہ ..... وہ ..... وہ ..... انار کی ڈالی پر ..... ہے نا؟"

"اوں ..... وہ تو فاختہ ہے ....."

"فاختہ نہیں بدھو' فاختہ۔ اصل میں یہ پری ہے"۔

"پری؟ ہنہ' تجھے کیسے معلوم؟"

"بس ہمیں معلوم ہے۔ بس کہہ جو دیا کہ یہ پری ہے۔ چپکی بیٹھی رہو۔ ابھی دیکھنا لوٹ پوٹ کر پری بن جائے گی"۔

مگر بدقسمتی سے اسی وقت ہمو کو چھینک آنا رہ گئی تھی' پھر سے فاختہ اڑ گئی۔

"دیکھا' گدھیا کہیں کی۔ چل' ادھر۔ لے کے چھینک مار دی۔ ابھی غصہ آ جاتا تو تیرے اوپر انجھر مار کر چوہا بنا دیتی"۔

"پری؟"

"ہاں"۔

"غصے میں چوہا بنا دیتی ہے؟"

"اور نہیں تو"۔

"چھٹ بھیا"۔

"ہاں"۔

"گھر چلو' ہمیں ڈر لگ رہا ہے"۔ ہمو بسوری' "ہم نہیں دیکھتے پریاں سریاں۔

ہنہ' بڑے آئے پریاں دکھانے والے ... بھوندو"۔

مگر چندر جی حیرت سے منہ پھاڑے پیڑ کے پاس پتوں کے ڈھیر کو گھور رہے تھے' ایک ننھا سا گلابی ہاتھ پتوں کے بیچ میں پڑا تھا۔

"ہاتھ!" چندر جی ایک دم سرپٹ بھاگے مگر ہمو ٹھوکر کھا کر گری اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگی۔ ہمو کو سہارا دے کر کچھ ڈر کم ہوا' اک تتلی ہاتھ کو پھول سمجھ کر اس پر آن بیٹھی۔

"دیکھو ہمو"۔ چندر نے ہمو کو چمٹا کر کہا۔

"ہاتھ؟ کون ڈال گیا یہاں؟"

"ضرور کوئی پری بھولے سے چھوڑ گئی ہو گی"۔ چندر نے رائے دی۔

"کہاں ہے پری"۔

"اڑ تو گئی"۔

"پر ہاتھ یہیں گرا گئی؟"

"جان پڑتا ہے بھولے سے رہ گیا۔ اسے اٹھا لے ہمو"۔

"چل، میں دیکھتی ہوں، اس لونڈے نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے کہ کبھی کتا کبھی بلی کبھی گلہری اٹھائے لئے چلا آتا ہے۔ پر آج تو کسی کی لونڈیا اٹھا لایا، مچھ کہیں کا۔ ارے او چندر نگوڑے، کیا اٹھا لایا رے"۔

"پری ماسی"۔ چندر نے اعلان کیا۔

"ہاں ماسی، بیچاری کے پر کھو گئے ہیں"۔ ممو نے طرفداری کی۔

کیوں رے یہ گھر ہے کہ گھورا کہ جو کوڑا کرکٹ ملا سو گھر میں۔ اسے منشی جی سے پھنکواؤ مردی کو، سارا کرسیوں کا ناس مار دیا۔

"چل بے ساکھی کے بچے اٹھا اپنی نانی کو"۔ منشی جی نے مہتر کو حکم دیا۔

"آں ہم ماریں گے بیساکھی تجھے"۔ چندر نے ہاکی اسٹک تانی۔

"کیا بات ہے؟ بڑے سرکار نے زینے پر سے ناک بھوں چڑھا کر کہا"۔

"دیکھو تو بیٹا نہ جانے کس کی لونڈیا اٹھا لایا ہے"۔

"واہ ہم نے تو پڑی پائی ہے۔ ممو سے پوچھ لیجئے"۔

"ہاں بڑے بھیا، بیچاری کے پر کھو گئے ہیں"۔

"پر؟"

"ہاں بھیا جی پر۔ یہ پری ہے نا، پتوں میں سو رہی تھی"۔

"اچھا بس ہو چکا کھیل، چلو اسے پھنکواؤ"۔

"نہیں ہم پالیں گے اسے"۔ چندر نے بچی کو سمیٹ کر قبضے میں کیا۔

ذرا سی بچی نہ جانے کیا سمجھ کر اس کے سینے سے بندر کے بچے کی طرح چپک گئی۔

"اے ہے، بڑا آیا پالن ہار۔ دیکھتی ہوں تو اس بلا کو کیسے پالتا ہے!"

ماسی نے بچی کا بازو پکڑ کر کھینچا اور اسے گندے چیتھڑے کی طرح اٹھا کر چلیں باہر پھینکنے۔

جانو چھوٹا موٹا طوفان ماسی کی جان پر ٹوٹ پڑا۔ ممو اور چندر ان سے چمٹ گئے، دانتوں اور ناخنوں سے ساڑی تار تار کر ڈالی۔ ممو نے جو زور سے دھکا دیا تو ماسی چاروں خانے چت۔ دونوں ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھے اور پست کر دیا۔ بچی یہ چہلیں دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسی اور تالیاں بجانے لگی۔

بڑے سرکار کو اتنے زور سے ہنسی آئی کہ ان کی ساری بڑائی خاک میں ملتے ملتے بچی۔ انہوں نے بڑے ضبط سے کہا:

"تا چھٹ بھیا، گھر چلو"۔ ممو کی گھگی بندھ گئی۔

"ارے ڈرتی کاہے کو ہے سڑن! ٹھیر، ذرا دیکھیں تو"۔

چندر نے ایک تنکا لے کر ڈرتے ڈرتے ہاتھ کو چھوا۔ ایک ننھی سی انگلی ہلی اور ایک مرغابی قاں قاں کرتی جھیل سے اڑی۔ دونوں لرز کر بھاگے مگر چندر مردانہ وار رک کر پھر واپس لوٹا، لکڑی سے پتے ہٹائے تو مٹی میں سے بھورے بھورے بال اور ایک سفید مکھڑا بھی دکھائی پڑا۔ دو بڑی بڑی سہمی ہوئی آنکھیں کھل پڑیں۔ ننھے ننھے ہونٹ لرزے اور چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی دو ڈیڑھ سال کی بچی پتے جھاڑ کر اٹھ بیٹھی۔ دونوں بچوں کی سٹی گم ہو گئی۔

"تم پری ہو نا؟" چندر نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

بچی نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

"دیکھا؟" چندر نے اکڑ کر ممو کو جتایا۔

"تمہارے پر کہاں ہیں پری؟" ممو کی بھی ہمت بڑھ گئی۔

بچی ڈری ہوئی آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ کر بسورنے لگی۔

"بدھو کہیں کی! رلا دیا بیچاری کو ٹافی کھاؤ گی پری؟"

بچی نے سر ہلا دیا۔

"ہائے بیچاری بھوکی ہے"۔ ممو کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ "اس کے پر تو ہیں ہی نہیں، اب کیسے اڑے گی چھٹ بھیا؟"

"تم روؤ نہیں پری۔ بیچاری کے پر کھو گئے ہیں، دوسرے نکل آئیں گے"۔

"رو مت پری"۔

"اب کیا کریں؟"

"چلو اسے گھر لے چلیں۔ اے پری، ہمارے گھر چلو گی؟"

بچی نے سر ہلا دیا۔ جب دونوں بچی کو لادے گھر پہنچے تو رامی کہارن کی تو چیخیں نکل گئیں:

"ہئی ہے۔ ماسی جی، چھوٹے بھیا کہیں سے لونڈیا اٹھا لائے"۔

"لونڈیا؟ اے چل دیوانی۔ کسی گوالے کی چھوکری ہو گی، پھنکواؤ موئی کو"۔

"اجی وے نا پھینکنے دیں، ماریں ہیں دونوں کے دونوں"۔

"اے کون دونوں"۔

"اے جی بوئی چھوٹے بھیا، ان کے سنگ میں ممو بٹیا بھی لگ گئی ہیں"۔

"رہنے دیجئے ماسی' پولیس چوکی خبر کروا دیجئے' وہ آ کر لے جائیں گے"۔

مگر بچے غل مچانے لگے' سورج کے پیروں سے لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔ ماسی نے دانت پیس کر کہا کہ "دیکھوں گی۔ چندر تھانے دار صاحب کو کیسے روکتا ہے!"

"ہم پولیس کو بھی ماریں گے" چندر نے ہاکی اسٹک سنبھالی۔ وہ سورما بنا پری کی حفاظت پر ڈٹا رہا۔

"ہتھ کڑیاں پڑ جاویں گی للا جی"۔

"ہم توڑ ڈالیں گے ہتھکڑیاں"۔

مگر پولیس نے آ کر تفتیش کی تو پتہ چلا آس پاس کے کسی گاؤں والے کی بچی نہیں ہے۔ نہ جانے کون پھینک گیا ہے"۔

"حرام کی ہوگی" ماسی نے فیصلہ کیا' "اناتھ آشرم میں بھجوا دو"۔

"جب تک اس کا کوئی وارث نہیں ملتا اسے یہیں رہنے دیجئے بچوں کا جی بھر جائے گا تو بھجوا دیں گے"۔ بڑے سرکار نے فیصلہ کیا۔

مگر بچی واقعی پری زاد تھی۔ اس کا کوئی وارث اس کی تلاش میں نہ آیا اور وہ وہیں رہنے لگی۔ اوشا رانی کے گڑیاں کھیلنے کے دن ابھی باقی تھے' انہوں نے پرانے کپڑے کاٹ کر جھمجھماتے ہوئے لباس تیار کئے۔ کچھ دن تو رسوائی کے پاس والی کوٹھڑی میں رامی کہارن کے ساتھ رہی پھر بچوں کے کمرے میں زمین پر سونے لگی۔ دیدی کی خوشامدیں کر کے اس کے نئے کپڑے بھی بنوا لئے۔ کبھی ماسی ایک دم بغاوت پر ڈٹ جاتیں کہ "نہ جانے موئی بھنگی کی ہے کہ چمار کی' سنک میز پر بیٹھ کر کھاتی ہے"۔ مگر اسے چندر اور ہمو کے ساتھ ساتھ اوشا رانی کی محبت بھی حاصل تھی۔ اس لئے بچوں کی ضد پوری ہوتی رہی۔ سورج کو کوئی شکایت نہ تھی بچی ان کی صورت سے لرزتی تھی' دیکھتے ہی بھاگ کر کسی کونے میں چھپ جاتی' چندر یا ہمو کی آڑ میں ہو جاتی یا اوشا کے آنچل میں منہ چھپا لیتی' روتی ہوتی تو ایک دم سانس روک لیتی' ہنستی ہوتی تو منہ پر ہاتھ رکھ کر چپ ہو جاتی۔ بڑے سرکاری

اپنے رعب کا اس پر یوں سکہ بیٹھتے دیکھتے تو اور پھول جاتے۔

اوشا اسے بندریا کی طرح پیارے پیارے کپڑوں میں سجاتی اس کا نام اسی نے چاندنی رکھا: چندر کی چاندنی...... اسی کو تو پڑی ملی تھی!

چندر اور ہمو اس پر فریفتہ تھے۔ بڑے فکر مند ہو کر کبھی غور سے اس کے کندھوں کو ٹٹولتے کہ کہیں پر' تو نہیں پھوٹ رہے ہیں۔ پر نکل آئے تو پھر سے اڑ

جائے گی!

ماسی کی مخالفت کے باوجود اس کی پڑھائی بھی ہوتی رہی کیونکہ وہ ہر دم بچوں کے ساتھ لگی رہتی تھی۔

"نہ جانے کیوں میرا جی آپ ہی آپ دھکڑ پکڑ ہوتا ہے۔ نیک شگن نہیں کہ راستے کا کوڑا آنکھوں میں گھس جائے"۔ ماسی ٹھنڈی سانس بھر کے کہتی' "بڑی ہو کے یہ لونڈیا نہ جانے کیا گل کھلائے گی!"

بڑے سرکار بہت بڑے تھے اس لئے نہ ان کے دوست نہ یار' نہ کہیں آنا نہ جانا۔ وہ تھے اور ان کی فلسفے کی کتابیں۔ گھوڑے کی سواری اور تیرنے کے سوا کبھی باہر نہ نکلتے۔ دور دور تک جاگیر پھیلی ہوئی تھی۔ اپنی نہر' اپنے جنگل اور جھیل۔ کاش چندر ہی ان کے ساتھ کا ہوتا تو اتنا جان لیوا اکیلا پن نہ ہوتا۔ چندر اور ہمو کی کیسی گاڑھی چھنتی تھی۔ کبھی ان کا دل چاہتا ایک دم ان کی طرح ٹھٹھے لگانے لگیں' پیڑوں پر چڑھ کر دھما دھم کودیں' مگر بڑپن آڑے آ جاتا۔

اوشا کو وہ کبھی نہ سمجھ سکے۔ شرمائی سی بیچاری مورتی چوری چوری انہیں تکنے کے سوا کسی مصروف کی نہ تھی۔ اسے جوان ہوتے دیکھ کر جو خیالات ان کے دل میں آئے ان کو گندہ سمجھ کر وہ ایک دم سہم گئے اور انہیں اس کے وجود پر غصہ آنے لگا۔ چندر گدھا تھا۔ پڑھائی سے جان چراتا۔ شریر سب کو پریشان کیا کرتا تھا۔ ماسی کا تو ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا بڑا ہو کر ضرور ڈاکو نکلے گا' موقع مل گیا تو ساری جائیداد پھونک کے کنگال ہو جائے گا۔ وہ ہنستا تھا' کھیلتا تھا' جھگڑتا تھا۔ ایک معمولی انسان تھا!

مگر سورج دیوتا تھے۔ ماسی روز ان کی آرتی اتارتی تھی۔ گاؤں والے انہیں اوتار مانتے تھے یہ نصیب کی بات تھی! بھگوان چاہے جسے دے' کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اور تو اور چندر کا کتا تک ان سے لرزتا تھا۔ ایک دن یونہی انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو دانت نکوسنے لگا۔ ماسی نے اسے ان کے کمرے میں جانے پر اتنا پڑوایا کہ وہ دروازہ دیکھتے ہی کانپ کر پلٹ جاتا۔

ایک دن بچے باغ میں گیند کھیل رہے تھے۔ چندر لڑکیوں کو خوب پدا رہا تھا کہ گیند چاندنی کے ہاتھوں سے بچ کر سورج کے پیروں کے پاس آن گری۔ بچوں کو پتہ چلا کہ گیند کدھر گئی۔ ڈھونڈتے آئے تو سورج نے اٹھا کر جیب میں ڈال لی اور انجان بن کر پڑھنے میں جٹ گئے۔ بچے جھاڑیوں میں گیند ڈھونڈتے رہے۔ سورج

کے دل میں سویا ہوا نوجوان لڑکا جاگ اٹھا۔ جیب سے گیند نکال کر بڑی حسرت سے دیکھی۔ اتنی سی عمر میں اتنا بھاری بوجھ کندھوں پر آن پڑا تھا کہ کبھی گیند جیسی حقیر چیز کی طرف دھیان ہی نہ جانے دیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر گیند کو زور سے اچھالا اور نیچے آتے آتے زور کا کک لگا دیا۔ خلاف توقع گیند زناٹے سے اڑی اور ٹھیک ماسی کی کھڑکی کو توڑتی ہوئی دھائیں سے ان کی کھوپڑی پر پڑی۔ ماسی بڑے دھیان میں ڈوبی لٹک لٹک کر گیتا کا پاٹھ کر رہی تھیں گیند جو سر میں لگی تو ڈر کے چنگھاڑیں، گیند کو خونی نظروں سے گھورا پھر دندناتی باغ میں پہنچیں۔ چندر گیند کی تلاش میں ادھر ادھر جھانک رہا تھا۔ جٹ ماسی نے اس کا کان پکڑ لیا اور اسے وڑاتی ہوئی بڑے سرکار کے حضور میں لے چلیں۔ چاندنی نے جو یہ چندر کی گت دیکھی تو بلبلا کر ماسی کی کلائی میں جھول گئی اور چوہیا جیسے نکیلے دانت گاڑ دیئے۔

"ہائے میری میاری"۔ ماسی نے تڑپ کر کان چھوڑ دیا اور ایک تھپڑ جو مارا تو مولسری کے تھانولے میں گری۔ اس سے پہلے کہ ماسی اس کا کچومر نکال دیتیں چندر اور ہمو اسے سمیٹ کر ڈٹ گئے۔

"مجھے مار لو ماسی پر اسے رہنے دو"۔ ہمو گڑگڑائی اور سارے وار اپنی پیٹھ پر سہ لئے۔ سورج نے یہ سب کچھ دیکھا تو ماسی کی حماقت پر بڑی ہنسی آئی۔ جب اس کے سامنے مقدمہ پیش ہوا تو وہ بڑی معصوم شکل بنائے کتاب پر جھکا رہا۔ ماسی کو اس پر بہت پیار آیا۔

"کیوں چندر، تم بڑے شریر ہو گئے ہو"۔ انہوں نے اسے ڈانٹا۔ تھوڑی دیر پہلے گیند پر لٹو ہونے والا سورج غائب ہو چکا تھا، صرف دیوتا سمان بڑے سرکار رہ گئے تھے۔ انہیں تو سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کہ وہ دونوں ہستیاں دراصل ایک ہیں۔ وہ ذلیل سورج بڑے سرکار نہیں کوئی اور تھا برائی کرنے کے بعد اسے دور کسی کونے میں چھپا دیا جائے تو پھر وہ ان کی اپنی ذات سے الگ ہو جاتی ہے۔ "بڑھیا جی ہم نے نہیں پھینکی"۔ چندر نے سہم کر کہا۔

"اور اوپر سے جھوٹ بولتے ہو۔ چلو ماسی سے چھما مانگو"۔

"معاف کر دو ماسی"۔ چندر نے ہتھیار ڈال دیئے اور ماسی سے معافی مانگ لی۔

گھڑیاں سالوں میں بندھتی چلی گئیں۔ وہ ننھا سا جامن کا پودا جو ہمو اور چندر نے جھیل کے کنارے لگایا تھا بڑھ کر دیوزاد بن کر جھومنے لگا۔ سورج کا رعب بھی دیوزاد بن کر سارے گھر پر چھا گیا۔ بچے ان کا اتنا مان کرتے تھے جتنا ماں باپ کا بھی نہیں کیا جاتا۔ چندر اب بھی ان سے نظر ملا کر بات کرتے گھبراتا تھا۔ ہمو ذرا لاڈلی تھی مگر دو بدو بات کرنے کی اس میں بھی ہمت نہ تھی۔ اوشا رانی کے دل و دماغ پر سب سے گہرا سایہ تھا۔ دیوزاد نے نہیں بالکل ہی مفلوج کر ڈالا تھا۔ ان کے دماغ اور دل پر بڑے سرکار کا راج تھا۔ مشین کی طرح وہ سورج دیوتا کے گرد چکر کاٹتی رہتی۔ انہیں ناشتہ کروانا، بیکن کھول کر دینا۔ انڈوں پر مقررہ مقدار میں نمک مرچ چھڑکنا، توس پر مکھن لگا کر دینا، پھر اپنے ہاتھ سے ان کے سامنے سے برتن اٹھانا۔ اس خدمت میں اب نہ کوئی لذت رہی تھی نہ کوفت۔

وہ بڑے سرکار کی ماسی ہے اور یہی اس کے نصیب میں لکھا ہے۔ اس کے لئے دنیا میں ایک مرد تھا۔ اور وہ سورج تھا۔ وہ ان کی جیون ساتھی بننے کے لئے پیدا ہوئی ہے: ایک دن اس کا بیاہ ہو گا، بڑے سرکار اس کا گھونگٹ اٹھائیں گے۔ یا یہ خدمت بھی داسی کو ہی انجام دینا ہو گی! منشی جی پہلے بچوں کے ماسٹر کی حیثیت سے آئے تھے، برسوں پڑھاتے رہے اور وہیں کے ہو رہے انہوں نے اوشا رانی کے عشق میں اپنی جوانی سکھا دی اسے دیکھ کر سوائے ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے اور کیا کر سکتے تھے! وہ اس کی پوجا کرتے تھے۔ پڑھاتے وقت سامنے سے گزر جاتی تو بوکھلا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتے۔ اوشا کو یوں انہیں بدحواس کرنے میں بڑا لطف آتا۔ وہ جان جان کر ان کا دل دکھانے کے لئے میٹھے میٹھے قہقہے لگاتی اور چھیڑ چھیڑ کر باتیں کرتی۔

"منشی جی اگر آپ کو پتہ چلے کہ کوئی آپ کا دیوانہ ہے تو آپ کیا کریں؟"

"جی ---- جی ---- میں ----" ماسٹر جی کے پسینے چھوٹ جاتے۔

"میرا مطلب ہے کوئی بھی۔ یوں سمجھئے جیسے کسی لڑکی کو کوئی بڑا ہی گنی انسان

پیار کرتا ہے تو اس لڑکی کو کیا کرنا چاہئے؟"

"وہ ..... وہ اس پر دیا کرے!" ماسٹر جی دھوتی سے پسینہ پونچھنے لگے۔

"کیا وہ صاف صاف کہہ دے کہ جی ہاں میں بھی آپ کو پسند کرتی ہوں؟"

"جی---- جی---- اگر----"

"اس میں اگر مگر کی بات ہے؟ آخر وہ ایک اونچی ذات کی کینا ہے' کوئی نیچ چھچھوری لڑکی نہیں' وہ پرش بھی بہت مہان ہے' بہت سندر اور گنی۔"

"جی؟" ماسٹر جی کو شبہہ ہونے لگتا یہ ان کا ذکر نہیں۔

"مگر وہ منہ سے تو کبھی کچھ نہیں کہتے" اوشا رانی اداس ہو جاتیں "شاید اس لئے کہ یہ اچھی بات نہیں۔ کیوں ماسٹر جی؟"

"جی---- جی ہاں----" ماسٹر جی اور بھی بجھ جاتے۔

اسی لئے تو وہ ان کی پوجا کرتی ہے' انہیں اپنا گرو مانتی ہے' ان کے چرنوں میں جیون بتانا اپنا دھرم سمجھی ہے' مگر وہ کچھ نہیں جانتے' تبھی تو کچھ نہیں کہتے۔ کیوں ماسٹر جی یہی بات ہے؟' اور ماسٹر جی کو اپنے عشق کا انجام صاف نظر آنے لگتا۔ اوشا رانی کا حسن اور جوانی بیچارے کے لئے ایک سزا بن کر رہ گئی تھی۔ کوئی سگا سوتیلا بھی نہیں تھا۔ جو زبردستی شادی کرا دیتا اور وہ اسے بھول جاتے۔ یونہی عاشق نامراد بنے سوکھ رہے تھے۔ اور سلگ رہے تھے۔ ایک ہی جگہ بوند بوند پانی ٹپکے جائے تو پتھر میں بھی گڑھا پڑ جاتا ہے' اوشا کے پیار میں دکھ سہتے سہتے جیسے دل میں گڑھے پڑ گئے تھے اور کچھ عادت سی ہو گئی تھی' مگر پیار اب کچھ کڑواہٹ دینے لگا تھا۔

کبھی اوشا سے چڑ کر بڑے سرکار اسے جھڑک دیتے' پھر ندامت مٹانے کو جھوٹی امید بندھانا پڑتی۔ وہ مسکرا کر بول لیتے تو اوشا رانی کے دل میں پھول کھل جاتے۔ ماسی اوشا کو سمجھاتی:

"بیٹی یہ تجھے اوندھی سیدھی باتیں کیوں سوجھتی ہیں؟ اگر تو پسند نہ ہوتی تو کیا زبردستی تھی' کہیں اور شادی کرانے کو کہتا۔ وہ تو کسی سادھو سنت کا اوتار ہے۔ رانی' ایسے لوگ عورت کو مٹی سمجھتے ہیں"۔

اوشا رانی کو قطعی انکار نہ تھا بشرطیکہ وہ اس مٹی کو سویکار کر لیں۔

کبھی ماسی کو اوشا پر غصہ آنے لگتا۔ اسی میں کچھ کمی ہے کہ آنکھوں میں نہیں جچتی۔ وہ اسے بنے ٹھنے رہنے کو کہتیں' تازہ فیشن کی تاک میں رہتیں' اسے کسی نہ کسی بہانے سے سورج کے آس پاس رکھتیں۔

مگر ماسی ٹھیک ہی کہتی تھی کہ یہ لونڈیا چاندنی بڑی ہو کر ضرور کچھ گل کھلائے گی' اس پر جو بہار آئی تو ایک دم گلزار بن کر مہک اٹھی۔ اتنا کٹیلا پن شریف زادیوں میں نہیں ہوتا۔ ضرور کسی بیسوا کی جائی ہو گی۔ کیا پتہ؟

اوشا شاید یہ حسن کا غرا تھا کہ یکایک نڈر ہو گئی۔ بڑے سرکار تک سے ڈرنا چھوڑ دیا۔ وہ آجاتے تو ایک دم سب کے منہ کو تالا لگ جاتا مگر وہ بہیۓ کئے جاتی۔

"چپ رہ چاندنی' بڑے بھیا آ رہے ہیں"۔ ہما اسے روکتی۔

"کاہے کو چپ رہیں جی' ہم کوئی گالیاں بک رہے ہیں۔ ارے تم بیکار کو ان سے ڈرتی ہو' ہم تو خاک نہیں ڈرتے۔ کل بڑی بڑی آنکھیں نکال کے گھورا تو سمجھے تھے مر جائے گی ڈر کے مارے!"

"ہائے ماں' تجھے گھورا بڑھیا نے"۔

"ہاں"۔

"پھر؟"

"پھر کیا میں نے منہ چڑھا دیا"۔ چاندنی ہنسی۔

"چل جھوٹی"۔

"قسم سے!"

"پھر؟"

"پھر کیا بھاگ آئی"۔

"اور جو ماسی دیکھ لیتی تو؟"

"ارے ماسی سے کون ڈرتا ہے! بس بس بھونکتی ہے' کاٹتی واٹتی کچھ نہیں"۔

"اچھا ری تو ان سے ڈرتی نہیں تو بڑے سرکار کاہے کو کہتی ہے؟"

"اور نہیں تو کیا کہوں"۔

"بڑھیا کہہ"۔

"دھت"۔

"کیوں؟"

"راجی چڑاتی ہے: کیا وہ تیرے ابھی سے جیسٹھ بن گئے جو تو انہیں بڑے بھیا کہتی ہے"۔

"جبھی تو مجھے لاج آتی ہے"۔

"پر ایک دن کہنا تو پڑے گا بڑھیا"۔

"چل ہٹ میں مار دوں گی' ہاں"- چاندنی بن کر شرمانے لگی-

چاندنی بلا کی چلبلی تھی' ابھی اس کی محبت میں سوز کم شرارت زیادہ تھی-

سرد آہیں بھرنے کے بجائے دھول دھپے میں لطف آتا تھا- ماسی پھن اٹھائے ہیوم سر پر سوار رہتی تھی- مجال ہے جو جوان لڑکا لڑکی ضرورت سے زیادہ گھل مل جائیں- ہاں اوشا کو وہ جان جان کے بڑے سرکار کے اکیلے کمرے میں بھیجتیں- شاید کچھ گھپلا ہو جائے تو پھر شادی کرنی ہی پڑے گی- مگر بڑے سرکار تو پتھر تھے- اوشا جیسی جونک بھی نہ لگ سکی- انہیں کبھی ڈر لگتا کہ کہیں یہ لونڈیا چندر کو نہ کسی پھندے میں پھانس لے' مگر انہیں یقین تھا اس میں اتنا دم نہیں کہ بڑے سرکار کی محبت اور رعب چندر کے دل سے نکال سکے - اب تک یہ حال تھا کہ نظر بھر کر دیکھ لیتے تھے تو پتلا پڑ جاتا تھا- کتنا ہی برا سہی پر بڑے بھائی پر جان نچھاور کرنے کو تیار تھا-

پھر یہ بھی سوچتی تھیں کہ اگر لونڈیا سے پھنس گیا تو پھر یہاں سے منہ کالا کر جائے گا' جائیداد کی طرف آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ ہو گی-

مگر چاندنی کی ساری دلیری اس دن ختم ہو گئی جس دن اسے بڑے سرکار کی نیت پر شبہہ ہوا- کوئی دوسری ہوتی تو کبھی خیال بھی نہ آتا- وہی اتنی نچ تھی کہ اسے ان کا نیچا پن معلوم پڑ گیا- بات یہ ہوئی کہ چاندنی نہا رہی تھی کہ نہ جانے کیسے اس کی چھٹی حس جاگ اٹھی اور ایسا معلوم ہوا کوئی غیر آنکھ اسے تاک رہی ہے- اس نے کپڑے اتار دیئے تھے' بالوں میں ریٹھے ڈال چکی تھی' اسے شبہہ ہوا باغ کی طرف کھلنے والے دروازے کے قریب کوئی ہے- چڑیل مہتر کی لونڈیا یا بڑی بدمعاش ہے' ہر وقت تاکا جھانکی کرتی ہے- اس نے جلدی سے تولیا باندھ لیا- دروازے کے شیشے پر جو پرچھائیں پڑ رہی تھی اس سے اندازہ ہوا بچہ نہیں- سایہ جلدی سے ہٹ گیا تو پالش لگے ہوئے شیشے پر جو تھوڑی دیر پہلے کالا نشان تھا ایک دم مٹ کر روشنی آنے لگی- یہ کالا نشان نہیں تھا- کسی نے پالش کھرچ کر جھانکنے کے لئے شیشہ صاف کر دیا تھا اور کسی گندہ ذہن انسان کی آنکھ تھی جو اسے چوکنا دیکھ کر بھاگ گیا- اس نے تھوڑا سا صابن نوچ کر شیشے پر چپکا کر بند کر دیا- مارے ذلت اور شرم کے اسے نہانا دشوار ہو گیا-

دوسرے دن اس نے اوشا سے کہہ کر مرمت کروا دی- مگر چند دن بعد اس نے دیکھا دوسرا شیشہ چنے برابر کھرچا ہوا ہے- وہ اوشا کے غسل خانے میں نہانے

لگی مگر ماسی نے اودھم مچانی شروع کی کہ یہ کاہے کے نخرے ہیں' اور وہ سہم کر رہ گئی-

مگر اس نے طے کر لیا کہ وہ کسی طرح جھانکنے والے کو پکڑے گی- اس نے شیشے کا سوراخ بند نہیں کیا' غسل خانے میں جا کر اس نے یونہی پانی گرانا شروع کیا' باغ کے دروازے کی کنڈی کھلی رکھی' اس کی نظریں شیشے پر جمی ہوئی تھیں' جھانکنے والے کو اندازہ نہیں تھا کہ اندر سے ہلکا سا سایہ دکھائی دیتا ہے- جیسے ہی کھرچی ہوئی جگہ پر آنکھ آئی چاندنی نے دھڑے سے دونوں پٹ کھول دیئے- سامنے بڑے سرکار کھڑے تھے- اور ان کی آنکھوں میں زمانے بھر کی غلاظتیں بجبجا رہی تھیں---- وہ سکتے میں کھڑی رہ گئی- پھر پلٹ کر اپنے کمرے میں جا کر زخمی چڑیا کی طرح گر پڑی-

اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا' جیسے اس نے بھگوان کو گوبر کھاتے دیکھ لیا ہو- اگر وہ کسی سے ذکر کرتی تو طوفان کھڑا ہو جاتا- پھر وہ اس گھر میں ایک منٹ نہیں رہ سکتی تھی- اس نے بہو سے صرف اتنا کہا کہ غسل خانے میں کوئی جھانکے نہ اس لئے کاغذ چپکا دیئے جائیں- بہو بیوقوفوں کی طرح منہ دیکھنے لگی - بھلا غسل خانے میں کون جھانک سکتا ہے! اس دن سے اس نے حتی الامکان بڑے سرکار کے سامنا جانا چھوڑ دیا- ان سے آنکھ ملانا تو بڑی بات تھی وہ ان کی طرف دیکھتی بھی نہ کھانے کے وقت بڑی مصیبت تھی مگر وہ چوہیا کی طرح بہو اور چندر کے بیچ میں ایک طرف دبک کر بیٹھ جاتی اور الٹے سیدھے نوالے نگل کر بھاگ کھڑی ہوتی-

بڑے سرکار اس سانحے کے بعد کئی دن اپنے کمرے سے نہ نکلے' نہ کھانا کھایا نہ کپڑے بدلے- رات رات بھر سگریٹیں پھونکتے اور ٹہلتے گزر جاتی- انہوں نے اس نابکار سورج کی بڑی ذلت کی جو اتنا نچ تھا- بس چلتا تو اس کا گلا گھونٹ دیتے-

ماسی اور سارے گھر والے حیران ہو گئے- وہ کسی کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے-

سوائے چاندنی کے سب ہی نے بار بار دروازہ کھٹکھٹایا- مگر انہوں نے جھڑک دیا- کئی دن کی پراشچت کے بعد انہیں یہ یقین ہو گیا کہ چاندنی نے کسی سے کچھ نہیں کہا تو ذرا ڈھارس بندھی- پھر انہیں خیال آیا کہ چاندنی کو ان کے جرم کا کیا پتہ! اگر وہ دروازے کے پاس کھڑے بھی تھے تو اس میں ایسے غضب کی کیا بات

تھی؟ ان کا گھر تھا' وہ مالک تھے۔ ہزار وجوہات ہو سکتی ہیں ان کے وہاں ہونے کی۔ چاندنی میں اتنی ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ ان کی نیت پر شبہہ کرے۔ اس یقین کے بعد وہ بڑی دیدہ دلیری سے باہر نکل آئے۔ اسی دن ماسی نے سرنا دیوی کے مٹھ کی جالی میں کلاوہ باندھ کر منت مانی تھی۔ یوں فوراً نشانے پر تیر بیٹھتے دیکھ کر وہ سرنا دیوی کے چرنوں میں اوندھی ہو گئیں۔

"ہے ہے بیٹا۔ میرا تو دم نکلا جاوے رہے' کیا بات ہوئی؟"

"کچھ نہیں ماسی' ذرا طبیعت بھاری تھی' سوچا برت ہی رکھ لیا جائے۔ آپ لوگ تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ مجھے کچھ فلسفے کی کتابیں دیکھ کر نوٹس بنانے تھے اس لئے"۔

جب وہ باہر نکلے تو چاندنی جھٹ اندر بھاگ گئی۔ اس کے بعد یہی ہوتا کہ سورج کے نکلتے ہی چاندنی گل ہو جاتی۔ بات آئی گئی ہو گئی' مگر شیر اور ہرنی کی دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ شیر کی بو پا کر ہرنی چوکڑیاں بھرنے لگی۔

راتوں کو کبھی چاندنی سوتے سوتے کوئی ڈراؤنا سپنا دیکھ کر ہچکیوں سے رونے لگتی' جیسے دور سنسان جنگل میں وہ سوکھے پتوں کے ڈھیر پر جا پڑی ہے' آس پاس بھیانک سناٹا ہے اور کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔ وہ بھاگ رہی ہے' دو آنکھیں اپنی بانبیوں سے نکل کر اس کی طرف رینگ رہی ہیں' اس کے پیروں میں الجھ رہی ہیں! لمبے لمبے سانپوں کی طرح لہرائی ہوئی آنکھوں نے اس کا بند بند جکڑ لیا ہے' ایک انجانا ڈر اس کے وجود کے ہولے ہولے پیس کر نکل رہا ہے۔ اس کی سانس رک گئی ہے' پھیپھڑے چپک کر چپاتی ہو گئے ہیں' اب دم واپس نہ آئے گا۔ اور وہ جنم جنم یونہی نیچے۔ بہت نیچے گرتی جائے گی۔ پھر اس کی آنکھ کھل جاتی' لمبا سانس کھینچ کر وہ ہچکیوں سے رونے لگتی' دھیرے دھیرے' کہ کہیں پاس سوتی ہوئی ہمو کی نیند نہ حیران ہو جائے۔

وہ کہاں پیدا ہوئی تھی؟ کیا اسے بھی کسی ماں نے جنم دیا تھا؟ اس کا بھی کوئی باپ تھا؟ تو پھر کیوں سب اس کو چھوڑ کر گم ہو گئے؟ یا شاید کوئی پری اسے دھرتی پر پھینک کر بھول گئی!

اس کا روم روم ٹھاکر خاندان کے بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا۔ گھورے پر سے اٹھا کر بیچ میں انہوں نے اسے شہزادی بنا دیا تھا۔ اور چندر---- بغیر چندر کے چاندنی کہاں ہو سکتی ہے؟ وہ دنیا کتنی دکھ بھر اور اندھیری ہو گی جہاں چاند ہو گا' وہ

چندر کی چھایا ہی تو تھی جبھی تو ہر دم اس میں سما جانے کی خواہش بچپن سے رکھتی تھی۔ کتنی ڈھارس تھی اس کے پیار میں! وہ اسی کی تھی---- اس نے پڑی پائی تھی نا!

ہمو! نہ جانے پچھلے جنم میں اس نے کون سے پن کئے تھے جو ہمو جیسی سہیلی انعام میں ملی۔ ہمو کی دوستی' بہتا پایا ممتا جو کچھ بھی کہہ لو' اس کے جیون کا سب سے حسین ،روان تھی۔ ہمو انسان نہیں کسی دیوی کا اوتار تھی' ہمیشہ ماں کی طرح اسے بچائے رکھتی۔

اوشا دیدی کے کیا کہنے' وہ تو اوشا دیدی ہیں نا۔ گھر کی رانی! کسی کو ان سے شکایت نہیں۔ سب کو پیار دیتی ہیں' سب کا خیال رکھتی ہیں۔ دل والی ہیں نا۔ مگر ان کے دیوتا بالکل کھڑنجا' آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے کہ پجارن ہاڑ ماس کی تیلی ہے یا بھربھری ریت کا ڈھیر! کچھ نہیں' مانگتی' دل کی سانگری سلگائے ماتھا ٹیکے پڑی ہے۔ کبھی تو دیوتا کی آنکھ جاگے گی' اس کے ہردے سے ست کا شعلہ کوند کر ان کے دل میں اتر جائے گا' پھر جیون سپھل ہو جائے گا۔ ہاتھ جوڑ کر چاندنی بھگوان کے حضور میں ماتھا ٹکا دیتی:

ہے بھگوان! کب پسیجو گے؟ اوشا دیدی کا کلیان کب ہو گا؟ چہیا کب تک پیاسی تڑپاؤ گے؟"

مگر چاچی تو صرف بھونکتی ہے' کاٹتی وہ بھی نہیں۔ جوانی میں میاں چل دیئے' تب سے بس اوشا کے لئے جی رہی ہے۔ اسے گھر کی رانی بنانے کی دھن میں ہر ایک کی سیوا پر جٹی ہوئی ہے۔ نہ کھانے کا شوق نہ پہننے اوڑھنے کا' بس ایک ہی فکر ہے کہ اوشا کا نصیب جاگ اٹھے ایسی کون سی بڑی بھاری آرزو ہے جو بھگوان کو پورا کرتے۔ آلس آتی ہے۔ ساری واںتا کل کل اسی بات کی تو ہے' کہ سرکار بھینٹ سویکار نہیں کرتے۔ اے پالن ہارا ان کے دل میں اوشا کا پیار بھر دے تو تیری خدائی میں کون سا ٹوٹا آ جائے گا؟ پھر یہ انجانے بھوت نہ ستائیں گے۔

اس نے باتوں باتوں میں یونہی ایک دن چندر کو ٹٹولا: "چندر جی۔"

"ہوں۔"

"چاندنی مر جائے تو کیا کرو گے؟"

"چاند ڈوب جائے تب ہی چاندنی مر سکتی ہے۔ تو مجھے کوس رہی ہے؟" چندر آنکھیں موند کر بولا۔

"ہائے میرا منہ جلے' تجھے کوسوں گی؟ پر زندگی کا کیا بھروسہ لوگ مرجاتے ہیں۔"

"چلی پگلی' اس وقت موت کیوں یاد آرہی ہے؟؟"

"پتہ نہیں چندرو جب تو پاس ہوتا ہے تو مرجانے کو من چاہتا ہے۔"

چاندنی نے ٹھنڈی سانس بھری اور اپنا گال اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ "اچھا اگر کوئی مجھے تجھ سے چھین لے تو؟"

"اوسنک' کوئی نہیں چھین سکتا' گولی ماردوں گا۔"

"تیرے بھیا بھی نہیں چھین سکتے؟؟"

ایک دم چندر اسے دور جھٹک کر اٹھ بیٹھا' اس کی آنکھوں میں چنگاریاں چٹخنے لگیں: "تو نے بھیا کا نام کیسے لیا؟؟"

"چندرو——" چاندنی نے سہم کر اس کا ہاتھ چھوا۔

"کمینی' وہ میرے بھگوان ہیں۔" دہشت سے چندر کی آواز گھٹ گئی۔

"بھول ہوئی چندر' میرے منہ سے نکل گیا۔ میں نے یہ تھوڑی کہا۔"

"منہ توڑ دوں گا جو آئندہ تو نے ایسی بات منہ سے نکالی۔ وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں' اور تو اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے بھنگن؟"

"میں تیرے چرنوں کی دھول ہوں چندر---- تیری چھایا۔" وہ پاس گھسنے لگی۔

"دور ہٹ' مجھے غصہ آرہا ہے۔ تو نے بھیا کو گالی دی۔"

"تو مجھے مار چندرو۔ زور سے تھپڑ مار۔" چاندنی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

"ہٹ۔" چندر نرم پڑ گیا۔

"چندر میں نے تو یونہی کہا پگلے' تو کیا سمجھ بیٹھا؟ تیرے میرے بھی مالک ہیں' میرا مطلب تھا وہ——— وہ مجھے گھر سے نکال دیں اور۔" چاندنی نے بات پلٹی۔

"تو میں بھی گھر سے نکل جاؤں گا' مگر ایسا نہیں ہوگا۔ بھیا بڑے نیک ہیں' میری ضد آج تک انہوں نے نہیں ٹالی۔"

"مگر میں—— میں تو رام جانے کون ہوں' تو ٹھاکر کا پوت۔"

"تو چاندنی ہے اور بس اس کے آگے میں کچھ نہیں جانتا۔" چندر نے اسے بانہوں میں لے کر اتنی زور سے بھینچا کہ اس کی جان کھنچنے لگی ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر دونوں لوٹ گئے۔ ایک دم چاندنی نے بچاؤ کے لئے چندر کے بال پکڑ لئے' مگر یہ

دیکھ کر اس کا دل کانپنے لگا کہ بجائے دور ہونے کے وہ اس میں سمانے لگی۔

ایک دم خشک پتوں میں سرسراہٹ ہوئی اور دونوں تڑپ کر دور ہو گئے۔ بڑے سرکار لاپرواہی سے آسمان کی طرف نظریں جمائے ہاتھ میں بندوق لئے دکھائی دیئے۔ چاندنی جلدی سے پیڑ کے تنے کی آڑ میں ہو گئی۔ یونہی بڑے سرکار نے چندر کی طرف دیکھا جو چور بنا گھاس پر پڑا تھا۔ ان کی آنکھوں میں سانپ پھنکار رہے تھے۔ چندر ایک دم ڈر کے کپڑے جھاڑتا کھڑا ہو گیا۔

ایک دم بڑے سرکار مسکرا پڑے' بڑی نرمی سے بولے:

"گیلی گھاس پر لیٹتے ہو' سردی ہو جائے گی۔ جا کر سویٹر پہنو۔"

"جی۔ جی۔" چندر بھاگنے لگا۔

"امتحان کی تیاری کر رہے ہو۔"

"جی۔"

"پڑھنے کے لئے یہ جگہ تو اچھی ہے پر کتابیں کہاں ہیں؟"

"آ---- وہ----- کمرے ہیں----"

"خیر کوئی بات نہیں' مگر قاعدے سے تمہیں بھی کمرے ہی میں سونا چاہئے۔"

"جی۔"

وہ ایک سوکھے ہوئے پیڑ کے تنے پر بیٹھ گئے' بندوق کھول کر خالی کارتوس نکالا اور پھونک سے نالی صاف کی۔ چندر بدھو کی طرح کھڑا تھا' انہوں نے جو بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو یک دم بھاگا۔

بڑے سرکار نے نیا کارتوس ڈال کر کھٹ سے بندوق بند کی۔ چاندنی کا دم نکل گیا' جیسے دھائیں سے گولی اس کے سینے میں لگی۔ وہ پیڑ کے تنے سے لگ کر کھڑے ہو گئے' پیڑ ہلا تو چاندنی منہ کے بل گرتے گرتے سنبھل گئی۔ آہستہ آہستہ پہلے بندوق کی نالی نظر آئی' پھر ہاتھ اور کندھا پیڑ کی آڑ سے سرکا۔ چاندنی دبے پاؤں سرک کر پھر آڑ میں ہو گئی مگر بندوق کی نال بھی اسی رفتار سے ایک دائرے میں گھوم کر پھر سامنے آ گئی۔ چاندنی بری طرح لرز رہی تھی' پسینے کی لڑیاں اس کے سارے جسم پر رینگنے لگیں۔ وہ تیزی سے مڑی کہ ایک ہی چھلانگ میں بھاگ نکلے مگر وہیں کی وہیں پتھر بن کر رہ گئی۔ بندوق کی نال اس کی آنکھوں کے سامنے سانپ کے پھن کی طرح پھنکار رہی تھی۔

دو گہرے کنوئیں---- جو میلوں دور گہرائی میں ڈوبتے چلے گئے تھے۔ جن کی

تہہ میں گولیاں تھیں۔ بندوق کی نال کے جادو سے آنکھیں چھڑا کر اس نے ان سے بھی زیادہ خطرناک زہر میں بجھی سنگینوں جیسی آنکھوں میں ڈرتے ڈرتے دیکھا تو نفرت اور غصے کے شعلے لپک رہے تھے۔ باوجود کوشش کے وہ ان کی آنکھوں کے بھنور سے اپنی آنکھیں نہ چھڑا سکی۔

مگر وہ سناٹے میں رہ گئی جب ایک دم بس بھری پھنکارتی ہی آنکھوں کے پھن جھک گئے' بڑے سرکار کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ نکلا بندوق کی نال پلکوں کی لرزش کے ساتھ جھکتی گئی۔ بڑے سرکار پر ایک دم جیسے پہاڑ ڈھے پڑا' ان کا لمبا چھریرا جسم جھول گیا کندھے جھک گئے ٹانگیں جلے ہوئے کاغذ کی طرح چر مر ہو گئیں اور وہ صابن کے جھاگ کی طرح اس کے قدموں میں سرنگوں ہو گئے۔

ہرنی کو گھائل کرنے میں اگر شکاری خود یوں چت ہو جائے تو وہ بھی دم بھر کے لئے بھونچکی ہو کر چوکڑی بھول جائے گی۔ مگر دوسرے لمحے وہ سنبھلی اور بندوق کی نال کو پھلانگتی ہوئی تیر کی طرح حویلی کی اور بھاگ کھڑی ہوئی۔

بیگار کی متھا پھوڑی ہے ماسی جی' اس چٹان پر پھول کھلانے کی آشا چھوڑ دو۔

منشی جی چٹکیاں بھرے جا رہے تھے۔ ماسی بڑے سرکار کے لیے ناشتہ سجا رہی تھیں۔ اوشا کو پکارا تو ویسے ہی سر جھاڑ جھنکاڑ اٹھی چلی آئی۔ ان گنوں بن چکیں رانی۔ الٹے پاؤں انھوں نے اسے کپڑے بدلنے کو واپس بھیجا۔ منشی جی بڑا گندہ سا قہقہہ مار کر چھیڑنے لگے۔

"بھونکے جا موئے۔ پیر کی جوتی کو بھی دن لگے ہیں کہ سر چڑھی آئی ہے۔" ماسی بگڑنے لگیں۔

"پر میں تو تمہارے ہی بھلے کو کہتا ہوں۔ کیوں بٹیا کی جوانی کو دیمک لگا رہی ہو۔ کیا ساری عمر ڈال پر ہی لٹکائے رکھو گی؟ میری کسم طوطے مینا ٹھونگیں مار کر کھوکھلا کر دیں گے۔"

"دیکھو منشی نگوڑے میرے منہ نہ لگ' ہاں۔"

پر میں کہوں کچھ بھید ضرور ہے! اپنی کسم سترہ سال سے ڈیوڑھی پر ڈیوٹی دے رہا ہوں آج تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔"

"اوئی' موئے نہ جانے کیا بک رہا ہے۔"

"تم ٹھہریں عورت ذات' اب تمہیں کیا بتائیں؟ پر سچ بتاؤ کبھی سنا کہ بڑے سرکار نے مہترانی کو چھیڑا کہ دھوبن کی کولیا بھر لی؟"

"اے پھنکار تیری صورت پہ' اسے بھی تو نے پنچ سمجھا ہے اپنی طرح! ٹھاکر کا پوت موئی مہترانی دھوبن سے چھیڑ کرے گا۔"

"ایسا تو نہ کہو میا' ہم جانیں ہیں ان ٹھاکروں کی نٹھرائی یاد ہے۔ بڑے ٹھاکر کا زمانہ؟ سالی دن سی گلی چھوڑ دی تھی!"

"تب ہی تو سڑ سڑ کر مرے میرا سورج ایسا نہیں۔ منشی تو نا سمجھے گا اسے گیان دھیان سے ناطہ رکھنے والے من میں کھوٹ نہیں رکھتے۔" ماسی نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔

"اچھا جی ہٹاؤ سالی مسترانی دھوبن کو اپنی اوشا رانی ہیں' کیا سندر تا ہے کہ دیوتاؤں کی رال ٹپکے' مگر بڑے سرکار نے کبھی ان سے پیار سے چھیڑ خانی کر لی؟"

"خبردار جو تو نے میری بٹیا کا نام لیا۔ حرام زادے' چل دور ہو۔" ماسی نے کھڑاؤں اٹھائی اور منشی جی دور بھاگے۔

"اچھا جی گرم کاہے کو ہوتی ہو' مگر کہے دیتا ہوں کچھ معاملہ ضرور ہے۔ ایسا بھی سالا کیا گیان دھیان۔ اپنی اوشا رانی کچھ مینکا سے کم ہیں؟ مگر میا یہ وشوامتر تو مجھے کاٹ کا الو جان پڑتا ہے۔ یہ سرنا دیوی کے ہاں کاہے کو بیکار متھا پھوڑی کر رہی ہو' یہ بھوت ان کے بس کا نا ہے۔"

کھڑاؤں ان کے نتھنے پر کھٹاک سے لگی اور وہ بلبلا کر کوستے ہوئے بھاگے۔

"ہائے رام مر گیا۔" وہ بلبلائے۔

"ہوش میں رہنا منشی جی۔" ادھر سے اوشا رانی بنی ٹھنی چلی آ رہی تھی' وہ سمجھی اسے منشی نے پھر چھیڑا منشی جی بھڑک اٹھے: "ایسی تیسی سالی کھڑاؤں کی بچی۔" انہوں نے کھڑاؤں میں زور کی ٹھوکر لگائی۔ "میرا صبر سمیٹو گی۔ تم ماں بیٹی تو یاد رکھو۔ ہاں۔" اور وہ لنگڑاتے' بڑبڑاتے چل دیئے۔

سر سے پیر تک گلابی جوڑے میں اوشا رانی بڑی نازک اور حسین لگ رہی تھی ۔ ستائیس برس کی بالکل نہیں معلوم ہوتی تھی۔ منہ پر شرم و حیا کی ہلکی ہلکی افشاں نے اور چار چاند لگا دیئے تھے۔

وہ ناشتے سے لدی پھندی کشتی لئے دبے پاؤں کمرے میں پہنچیں تو بڑے سرکار ہاتھ میں شکاری چاقو لئے میز پر جھکے ہوئے تھے ان کے سامنے ننگی عورت کی ایک تصویر بری طرح کٹی پھٹی پڑی تھی۔ اوشا کی چیخ نکل گئی اور کشتی ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔

بڑے سرکار چونک کر پلٹے۔ اوشا نے دیکھا اس کے سامنے اس کے من مندر کے دیوتا کے بجائے ایک شیطان کھڑا ہے' اس کے خونخوار دانت باہر کو نکل آئے ہیں اور آنکھوں میں دیوانہ پن بھرا ہے۔

"کیوں آئی ہو تم؟" بڑے سرکار نے زور سے چاقو میز پر مارا اور تصویر سمیٹ کر مسل ڈالی۔

"نا---- ناشتہ----" اوشا نے لرز کر کہا اور ایک دم منہ چھپا کر جانے لگی۔

"اوشا۔" وہ ڈر کے ایک دم کھڑے ہو گئے۔ اوشا رک گئی۔

"اوشا' ادھر آؤ۔" بڑی نرمی سے بولے۔

"جی۔" اوشا نے پلٹ کر کہا۔

"تم---- تم۔ ---اتنی تکلیف کیوں اٹھاتی ہو؟"

"تو اس میں کیا برائی ہے؟ جیسے نوکر لایا ویسے میں اٹھا لائی!"

"مجھے اچھا نہیں لگتا۔" اوشا نے کچھ جواب نہیں دیا' آنسو پونچھ کر جانے لگی۔

"سنو۔"

وہ پھر رک گئی۔

"تم نے میری بات کا برا تو نہیں مانا۔" بڑے سرکار نے کن انکھیوں سے نوکری کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں' اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟ میری بھول تھی' کشتی گر گئی۔"

"اصل میں میں پریشان تھا۔ یہ تصویر۔"

"جی؟"

"چندر کی حرکتوں نے تو عاجز کر دیا ہے۔ پتہ نہیں اس کے سر میں یہ گندگی کیوں بھری ہوئی ہے۔ ایسی بیہودہ تصویریں کہاں سے لاتا ہے؟"

اوہ! تو یہ تصویریں انہوں نے چندر سے چھینی ہوں گی۔ ایک دفعہ ان کے کاغذات درست کرتے میں اوشا کو تصویریں ملی تھیں۔ اسے چندر پر بہت غصہ آیا۔ سور کہیں کا! ٹھیک ہی تھا غصہ' ایسی گندی تصویریں کاٹ کر پھینکنے کے لائق ہیں۔

اوشا کے جانے کے بعد بڑے سرکار میز پر پست ہو کر گر پڑے۔ میز پر کھینچے ہوئے چاقو کے گھاؤ ابھر کر گرم گرم زندہ گوشت کی طرح مچلنے لگے ان کا سارا جسم پسینے سے بھیگ گیا' عاجز آکر انہوں نے مٹھیاں بھینچ کر کہنیوں پر رکھ لیں اور لمبی لمبی سسکیاں بھرنے لگے۔

ہانپتی کانپتی چاندنی پلنگ پر گر کر سسکیاں بھرنے لگی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا اس کا سارا جسم خونم خون ہو چکا ہے۔ جسم پر کوئی خراش نظر نہیں آئی مگر دم ٹوٹنے کا احساس دل کو سرد سرد انگلیوں سے چھوئے جا رہا ہے

اگر کوئی آجاتا' کوئی دیکھ لیتا؟

کاش چندر دیکھ لیتا۔ پھر وہ زندہ نہ رہ پاتی' چھٹی ہوتی۔

وہ تو اتفاق سے اصطبل سے گھوڑا چھوٹ کر لان پر آگیا۔ اور اس کے ساتھ تمام نوکر چاکر بھی دوڑ پڑے' ورنہ اس وقت لاؤنج کے سفید براق قالین پر اس کے خون کے لال لال پھول کھلے ہوتے۔ وہ زینے سے بے تحاشا اتری چلی آ رہی تھی' اس کی جھاگ سی اوڑھنی پیچھے بھاگ رہی تھی' ایک ہاتھ سے اس نے کتابیں سنبھالیں اور دوسرے ہاتھ سے دوپٹہ' مگر جھٹکا دینے پر دوپٹہ چھوٹ گیا۔ اس نے مڑ کر دوپٹہ اٹھانا چاہا تو ہاتھ ہوا میں اڑتا رہ گیا اور کتابیں ہاتھ سے چھوٹ پڑیں۔ زینے کی سب سے بلند سیڑھی پر بڑے سرکار کھڑے تھے اور ان کے ہاتھ میں اس کا دوپٹہ تڑپ رہا تھا۔

لمبے لمبے سانپ ان کی آنکھوں کے حلقوں سے نکل کر اس کے گرد لپٹنے لگے۔ بڑے سرکار کے ہاتھ میں شکاری چاقو تھا اور کلائی کو ہولے ہولے بل دے کر وہ اس کا دوپٹہ لپیٹ رہے تھے۔

"بہت ڈر لگ رہا ہے؟" انہوں نے اس کے اوپر جھک کر پوچھا اور چاقو کی نوک سے اس کے گریبان کا بٹن چھوا۔ ہولے سے انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ہتھیلی پر چاقو کی دھار رکھ دی۔ مگر چاقو اس کی ہتھیلی کے پار ہونے کے بجائے اس کی کلائی پر رینگنے لگا۔ پھر بازو سے ہوتی ہوئی اس کی نوک نرخرے پر ٹک گئی۔

چاندنی کی روح تک برف کی دھار اتر گئی۔ وہ آنکھیں جھکائے سانس روکے کھڑی رہی۔ چاقو پھرتی سے مڑا اور گریبان کا پہلا بٹن کٹ کر سیڑھیوں پر ٹنگ ٹنگ کرتا نیچے اتر گیا۔

ایک ایک کر کے سارے بٹن ہوا کے اشارے سے کٹ کر گر گئے بغیر سسکی بھرے لمبے لمبے آنسو اُمڈ اُمڈ کر گالوں پر بہتے رہے۔ بس کسی سے لٹکے ہوئے ہاتھوں کی ساری طاقت سلب ہو چکی تھی۔ چاقو کی سرد نوک عین اس کے دل کی دھڑکن پر آکر ٹھٹک گئی۔ آگ کا ایک برما اس کی روح کی گہرائیوں کو چیرتا ہوا دھنسنے لگا، دماغ میں خاموش دھماکے چھوٹنے لگے۔

اس سے پہلے کہ جوالا مکھی پھٹ پڑتا اور وہ اس میں بھسم ہو جاتی گھوڑا چھوٹ کر لان پر طوفان مچانے لگا اور ایک دم جیسے دنیا جاگ پڑی۔ چاندنی شل ہو کر سیڑھیوں پر سرنگوں ہو گئی۔ اس نے دیکھا بھی نہیں کہ بڑے سرکار کدھر غائب ہو گئے۔ وہ تھے بھی وہاں یا ان کا بھوت تھا، یا خود اس کے پریشان دماغ کا تراشا ہوا چھلاوا تھا جو دم بھر میں گم ہو گیا!

وہ کس سے کہے؟ اور کیا کہے؟ ایک چیونٹی ایک مہان دیوتا کے خلاف کیسے زبان کھول سکتی ہے؟ کون ہے اس کا گواہ اور کون وکیل؟ جو اس کی گوئیاں تھی، اس پر جان چھڑکتی تھی مگر کیا وہ بڑے بھیا کی شان میں یہ گستاخی برداشت کر سکے گی؟

بڑے سرکار اس سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ وہ ڈرتے ہیں کہیں چندر اس سے ناطہ جوڑ کر ٹھاکروں کے خاندان کو داغ نہ لگا دے وہ نیچ ہے، کسی کے پاپوں کا پھل ہو گی تبھی تو اسے کوڑے پر پھینک دیا گیا۔

ایک بار پھر ایک گولی سی اس کی چھاتی پر لگی: سامنے ہال میں بڑے سرکار کی تصویر سنہری چوکھٹے میں جگمگا رہی تھی، اس کے سامنے پھول اور عود دان میں بجھے ہوئے کوئلے پڑے تھے۔ روز شام کو اوشا رانی اس تصویر کے سامنے تازہ کلیاں چن کر ڈالتی تھیں ور سارے کمرے میں دوب گھما کر عود دان تصویر کے قدموں میں رکھ دیتی تھیں۔

اس کا جی چاہا ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر تصویر پر کھینچ مارے۔ غصے اور نفرت سے اس کا منہ سوکھ گیا، جیسے حلق تک راکھ اٹ گئی ہو۔

ایک دم اسے معلوم ہوا جیسے تصویر مسکرا رہی ہے، زہر بھری آنکھیں ناچ رہی ہیں۔ وہ پلٹ کر بھاگی اور سیڑھیوں سے اترتے ہوئے چندر سے ٹکرا گئی۔

"کیا ہے جی۔" چندر نے اسے سنبھال لیا۔

"ہائے چندر جی۔" وہ اس کی چھاتی پر ہونٹ رکھ کر پھوٹ پڑی چندر نے فوراً

موقعے سے فائدہ اٹھا لیا۔ اس کے پیار میں، اتنا لطف اتنی مٹھاس تھی کہ چاندنی پگھل گئی۔

"ہے رام! چندرو مجھے کھا لے، سموچا کھا لے۔" وہ پیار کی شدت سے تڑپ اٹھی۔ چندر کے قرب سے اس کے دماغ میں چنگاریاں پھوٹنے لگیں تھیں، تب اسے چندر پر غصہ آنے لگتا تھا۔ ایک ہی وقت میں اس میں سما جانے اور اس سے دور بھاگنے کا جذبہ ابھی اس کے قابو میں نہیں آیا تھا۔ پندرہ سال کی چاندنی زندگی کے بہت سے سوالوں کا جواب نہ پا کر خوف زدہ رہ جاتی تھی۔ ایک انجانا خوف اسے چندر کے قرب کی لذت سے دور بھاگنے کی ترغیب دیتا اور جب درمیان میں فاصلہ حائل ہو جاتا تو جی سسکنے لگتا۔

ذرا سی دیر میں چندر نے اسے ہنسا دیا۔ تھوڑی دیر پہلے کی سہمی ہوئی بچی دم بھر میں مغرور حسینہ بن کر اترانے لگی۔ ہرنی کی طرح بھاگتی، قہقہے لگاتی وہ لان پر سے کاوے کاٹتی برآمدے پر چڑھ گئی۔ اندر ڈرائنگ روم میں اندھیرا تھا۔ دریچوں میں سے دھندلی دھندلی روشنی چھن رہی تھی۔ چندر ایک گملے سے الجھ کر گرا اور وہ قہقہے لگاتی گیلری کی طرف بھاگنے لگی۔ مڑ کر اس نے دیکھا، چندر کے قدموں کی چاپ سے اسے اندازہ ہو گیا کہ اب راہ فرار نہیں، وہ ضرور پکڑے گا۔ جونہی وہ زینے کی طرف جانے کے لئے پلٹی دو فولادی ہاتھوں نے اسے جکڑ لیا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر سلگتا ہوا پھن محسوس کیا اور سن سن کرتا ہوا زہر اس کے وجود میں ڈوب گیا۔ نیچے---- نیچے وہ تہہ میں جا لگی۔ اب کبھی سانس واپس نہ آئے گی۔ دور چندر کے قدموں کی آواز کھوتی جا رہی تھی۔ چندر---- چندر مان---- تن من کا زور لگا کر وہ تہہ سے ابھری اور بھاگ کر چندر کے سامنے منہ کے بل گر گئی۔

"ارے کیا ہوا؟" وہ اس کی گھگی بندھی دیکھ کر ڈر گیا۔

"وہ---- وہ----" اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، اور آواز حلق میں گھٹ رہی تھی۔

"کیا ہے پگلی" چندر نے گیلری میں جا کر دیکھا۔ ستون سے سہارا لئے بڑے سرکار کھڑے تھے، ان کے چہرے کا بھیانک پن دیکھ کر چندر خود ڈر گیا۔

"ارے بڑے بھیا۔ کیسی پگلی ہے چاندنی، آپ کو دیکھ کر ڈر گئی۔" چندر کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا اور جلدی سے چاندنی کو اپنے سے دور دھکیل دیا۔ پھر بدھوؤں کی طرح سر کھجانے لگا۔ دوسرے ہاتھ میں سگریٹ تھی، جھٹ جیب میں ڈال کر مسل

دی۔

چاندنی نے کچھ کہنا چاہا' پھر چندر کے احمق چہرے کو دیکھا اور سسکیاں بھرتی بھاگی۔ چندر بھی کترا کر جانے کو مڑا تو بڑے سرکار نے بڑی گمبھیر آواز میں پکارا:

"چندر۔"

"جی۔" چندر اچھل پڑا۔

"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ مہربانی سے میرے ساتھ آؤ۔"

چندر ان کے لہجے کی سختی سے لرز اٹھا مگر چپ چاپ بھیگی بلی بنا ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

"بیٹھو۔" بڑے سرکار نے اشارے سے کہا اور بے چینی سے ٹہلنے لگے۔ چندر کے پسینے چھوٹ رہے تھے' جی چاہ رہا تھا چپکے سے کھسک لئے' پھر کئی دن صورت نہ دکھائے۔ اتنے دن میں بڑے سرکار سب بھول بھال جائیں گے۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک دم رک گئے اور چندر کو ایسے گھورنے لگے جیسے سموچا نگل ہی تو جائیں گے۔

"یہ لیجئے۔" انہوں نے ایک جھٹکے سے سگریٹ کیس پیش کیا۔

"جی---- جی نہیں۔" چندر اچھل پڑا۔

"خیر' آپ کی مرضی' شاید چوری چھپے پینے ہی میں زیادہ لطف ہے۔" جب بڑے بھیا کو بہت غصہ آتا تھا تو وہ آپ جناب پر اتر آتے تھے۔

"تم چاندنی سے محبت کرتے ہو؟"

"جی---- جی---- نہیں---- جی----" چندر کی گھگی بندھ گئی۔ وہ اس قدر شدید حملے کے لئے تیار نہ تھا۔

"جھوٹ بول کر ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔" وہ گرجے۔ تمہاری حرکتیں ضرورت سے زیادہ ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔ غصے میں ایک اور بھی حرکت کرتے تھے' یعنی انگریزی میں ڈانٹتے تھے۔

چندر کا سر اور نیچے جھکتا جا رہا تھا۔ بڑے بھیا فرانٹے سے لکچر جھاڑ رہے تھے۔ چاندنی سے محبت کرنے کا الزام کوئی نئی بات نہ تھی: ہمو اسے مستقل چھیڑا کرتی تھی' ماسی بھی طعنے دے چکی تھی اور اوشا دیدی نے تو جیسے بات ہی پکی کر دی تھی۔ مگر وہ ہمیشہ "ہشت" کر کے ٹال دیا کرتا تھا۔

شادی کی ضرورت اس نے ابھی تک محسوس نہیں کی تھی۔ مگر بڑے بھیا کے

منہ سے یوں پھٹ سے سن کر اوسان خطا ہو گئے۔

"میں نے کیا غلطی کی ہے چندر۔"

"جی؟" چندر نے بے دھیانی میں قطعی نہیں سنا کہ بھیا جی کیا کہہ رہے تھے۔

"کیا آج تک میں نے کوئی حرکت کی ہے جس سے تمہیں یا پرمیلا کو یا گھر کے کسی بھی فرد کو نقصان پہنچا ہو۔"

"جی نہیں بڑے بھیا۔"

"کیا میں نے ایمان داری سے اپنا فرض پورا نہیں کیا؟ کیا تمہارے ساتھ کچھ ناانصافی کی ہے؟ میں نے تمہیں شکایت کا کون سا موقع دیا ہے؟"

"نہیں' کبھی کوئی ناانصافی نہیں کی بڑے بھیا۔"

"تو پھر تم مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہو؟"

"میں؟ میں تو بڑے بھیا۔" چندر منمنایا اور بھاگ نکلنے کے پینترے سوچنے لگا۔

"تم جانتے ہو تمہاری اس نیچ حرکت کا خاندان پر کیا اثر پڑے گا؟ دنیا کیا کہئے گی؟ تم---- اسے چاہتے ہو' جھوٹ مت بولو۔ وہ تمہارے دل و دماغ پر آسیب بن کر چھا چکی ہے' تمہارے ہوش حواس گم ہو چکے ہیں اور تم جال میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہے ہو اور کچھ نہیں کر سکتے۔ ایک حقیر چیونٹی نے پہاڑ کو اپنے قدموں میں جھکا دیا ہے۔ تم جانتے ہو تم کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟ تم سوریہ ونشی ہو اور وہ---- وہ ایک گمنام نیچ چھوکری جس کے ماں باپ کا پتہ نہیں' جو شاید کسی بے شرم انسان کے پاپوں کا پھل ہے: تم اس سے بیاہ کر کے خاندان کے نام پر داغ لگانا چاہتے ہو' تم اندھے ہو گئے ہو' تم نہیں جانتے اس کا انجام کیا ہو گا۔ تم پاگل ہو جاؤ گے---- پاگل---- پا---"

ایک دم بڑے سرکار خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے---- ان کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور وہ آئینے کے سامنے کھڑے خود اپنے آپ کو پھٹکار بھیج رہے تھے۔ سہم کر انہوں نے چندر کی طرف دیکھا مگر کرسی خالی تھی۔ چندر نہ جانے کب بھاگ گیا اٹھ کر۔

"اوہ بھگوان! بھگوان!" وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئے۔ "مجھ سے کون سی چوک ہو گئی جس کی اتنی کڑی سزا دے رہے ہو۔ نہ جانے کب تک اکیلے وہ اپنے ذہن کے لگائے ہوئے زخموں کی آگ میں پڑے جھلستے ہے' تڑپتے رہے۔

جلتے جلتے خون کی ایک لہر بڑے سرکار کے دماغ سے ٹکرائی' ان کے ہاتھ میں قلم کانپنے لگا اور آنکھوں کے آگے سرخ بگولے ناچنے لگے۔

"تم---- تم اسے پسند کرتے ہو؟" انہوں نے گھٹی ہوئی آواز میں منشی سے پوچھا۔

"جی---- جی سرکار۔ لونڈیا ہے تو پٹاخہ' دہائیں سے کلیجے پر چوٹ لگتی ہے اور پھر حضور میں نے سرکار کا نمک کھایا ہے' اگر آپ میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہنیں تو بھی میرے بھاگ چھوٹے سرکار بالکل ہی قابو سے باہر ہوئے جا رہے ہیں۔" انہوں نے دوسرے کاغذات دستخط کے لئے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی پریشانی بھی دور ہو جائے گی اور میں۔" منشی جی منہ ہی منہ میں رس گلا گھلا کر بولے۔

"اور تم---- اور بڑے سرکار کی گردن کی رگیں سلاخوں کی طرح تن گئیں' تلوے سنسنانے لگے اور نتھنے پھول گئے۔

"جی ہاں سرکار' اکیلی جان کب تک گھسیٹوں! دو چار سال میں جوان پٹھی ہو جائے گی تو مصیبت ہو جائے گی۔ ماسی جی کی تو ابھی سے نیندیں اچاٹ ہو گئی ہیں۔ کوئی ایسی ویسی بت کر بیٹھے چھوٹے سرکار تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ان کا بھی کیا دوش' لڑکی ہے ہی آفت کی پر کالہ' بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دے سرکار' پھر وہ تو نادان ہیں۔ اسی لئے میں نے سوچا میں کس دن کام آؤں گا؟ ہاں سرکار رام جانے بھنگی کی ہے کہ چمار کی' مگر حضور کے ٹکڑوں پر پلا ہوں میرا کیا ہے----"

"تم اس سے---- شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں' قصہ ختم ہو جائے گا' کسی کو کچھ کہنے سننے کی ہمت بھی نہ رہے گی۔"

"تمہیں---- تم اسے پسند کرتے ہو؟" بڑے سرکار نے دانت پیسے' ان کی آنکھوں میں بھوت ناچنے لگے' پتلیاں چڑھ گئیں' ہونٹ بکس گئے۔ ایک دم منشی جی کی ہنسی ہونٹوں پر جم گئی' وہ گھگیا کر پیچھے ہٹے مگر بپھرے ہوئے شیر کی طرح ایک

جست میں بڑے سرکار نے ان کا ٹینٹوا پکڑ لیا۔

"حضور خطا ہوئی' سرکار!" تڑپ کا منشی جی ان کی گرفت سے نکل گئے اور وہیں پیروں پر سر ٹکا کر گڑگڑانے لگے۔ ایک دم سہم کر بڑے سرکار پیچھے ہٹ گئے۔

"سمجھا' سمجھا سرکار---- مجھے کیا معلوم تھا۔" منشی جی نے دھوتی سمیٹ کر کھسکتے ہوئے ہاتھ جوڑے۔

"کیا نہیں معلوم تھا۔" بڑے سرکار پلٹ کر پھنکارے۔

"کچھ نہیں حضور' کچھ بھی تو نہیں۔" "تو کیا سمجھتا ہے پاجی؟"

"کچھ نہیں سرکار' میں تو کچھ نہیں سمجھا۔ بھلا میں کیا سمجھوں گا؟ میں---- میں----" منشی جی اٹھ کر تھم پشتم بھاگے اور باہر کھڑی ہوئی اوشا رانی سے ٹکرا گئے۔

"ارے تیرا ستیاناس۔" انہوں نے دھوتی کی لانگ کو گالی دی جو ان کے پیروں میں الجھ رہی تھی۔ "رام رام ہے شری رام' ہتر ڈھیلے کر دیئے نروئی نے۔"

"منشی جی کی صرف انہوں نے ٹھکائی دیکھی' ایک دم جی خوش ہو گیا اور ہنس کر بولیں۔

"ارے منشی جی تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے' تمہاری موت آئی ہے کہ بڑے سرکار کے منہ آنے لگے؟"

"ایسی کم تیسی منہ آنے کی۔ رام رام' حد ہو گئی! کیا غضب ہے۔ بھگوان---- اب تو سادھو سنت کا بھی کوئی بھروسا نہیں' رام قسم کوئی بھروسا نہیں۔"

"ارے تو بات کیا ہوئی؟ بڑے سرکار نے آج تک کسی کو انگلی تک نہ چھوائی' کوئی ایسی ویسی بات اس نکھٹے نے کہہ دی ہو گی جو یوں دھیرج کھو بیٹھے۔"

"بات کیا ہوتی تمہارا سر۔" منشی جل گئے۔

"اچھا بس بوریا بستر باندھو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

"ارے مر گئے بستر بوریا بندھوانے والے۔ میں کہوں اب تم اپنی خیر مناؤ۔ پٹ رانی بننے کے سارے سپنے بھول جاؤ۔ رانی وانی تو کیا گھر میں سر چھپانے کو جگہ بھی مل جائے تو بہت سمجھنا۔"

"جانے کیا بک رہے ہو پاگلوں کی طرح۔"

"بک نہیں رہا ہوں رانی' میری مانو تو اب خیر مناؤ۔ ارے وہ ٹھیرے مائی باپ جو کریں سو تھوڑا' مگر سچ کہتا ہوں بس کا کانٹا ہے لونڈیا۔"

"کون لونڈیا؟"

"ارے بابا مجھ سے مت پوچھو' آنکھیں ہیں تو خود دیکھ لو ہے بھگوان' آثار اچھے نہیں۔ سارا کنبہ انٹ سنٹ ہو جائے گا' بڑے زوروں کی مہا بھارت ٹھنے گی' بھائی بھائی کو کھا جائے گا۔"

"اوہنہ' سڑی ہو تم تو۔" اوشا رانی جل کر اندر چلی گئی۔

بڑے سرکار پسینے میں شرابور میز پر سر دھرے بے دم بیٹھے تھے گھٹی گھٹی سسکیوں سے ان کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ یوں ایک باوقار مرد کو ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرح بکھرا دیکھ کر اوشا رانی دہل گئیں' نہ جانے کب کی سوئی ہوئی ممتا جاگ پڑی' جی چاہا ان کا غم سے بھاری سر اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگائے' مگر شرم نے روک دیا۔

اس کی آہٹ سن کر بڑے سرکار نے سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں میں دکھ اور ناچاری کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا' ہونٹ پٹے ہوئے بسورتے بچے کی طرح لرزنے لگے' دھتکارے ہوئے بھکاری کی طرح انہوں نے اوشا کو دیکھا اور تڑپ کر رہ گئے' ان کا جی چاہا اوشا کے پیروں پر سر پٹخ دیں اور کہیں:

"اوشا رانی مجھے بچاؤ۔ اس بھیانک غار کے اژدھوں سے مجھے بچا لو۔ ایک بار درد سے پھٹتی ہوئی پیشانی پر اپنے پوتر ہونٹ رکھ دو سارے گناہ دھل جائیں گے۔"

مگر بڑے سرکار نے اپنے زخم چھپانا سیکھا تھا! جہاں وہ پہنچ چکے تھے وہاں نہ کوئی ہمدم تھا نہ ہمراز' بس وہ تھے اور اکیلا پن ایک دم انہیں اپنی پوزیشن کا خیال آگیا' غرور سے گردن اکڑ گئی' بڑی بڑی گمبھیرتا سے بولے: "کیا ہے؟"

"منشی جی کے لئے کیا حکم ہے؟"

"منشی جی؟ منشی جی کو گرم کپڑوں کے لئے دو سو روپے دے دو۔"

"مگر----" اوشا رانی دھک سے رہ گئیں۔

"گوپال سے کہو چائے ٹیرس پر لے آئے"۔ انہوں نے نہایت بے رخی سے کہا۔

"یہ----یہ---- منشی جی----"

"کیا کہنا چاہتی ہو منشی جی کے بارے میں؟"

"جی وہ----"

"کیا تمہیں میرے رویے سے دکھ ہوا۔" وہ بڑی رکھائی سے بولے۔ "اگر ایسا ہے تو مجھے بڑا افسوس ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم انہیں پسند نہیں کرتیں۔"

"جی ہاں۔"

"مگر معلوم ہوتا ہے میں غلطی پر تھا۔" بڑے سرکار نے ایکٹنگ شروع کر دی۔

"میں---- میں سمجھی نہیں۔"

وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے' تمہیں منظور ہے تو۔"

"نہیں اوشا رانی نے آنسو روک کر کہا۔

"لیکن اگر تم چاہو تو----" انہیں اوشا رانی کو دکھ دے کر بڑا مزا آتا تھا' جیسے خود ان کے دکھوں کا مداوا ہو جاتا ہے۔

"ہرگز نہیں۔" اوشا رانی رو پڑیں۔

"اوہ' یہی سمجھ کر میں نے انہیں ڈانٹ دیا' مگر کچھ زیادہ غصہ آگیا۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا۔" اوشا جوش سے بے قابو ہو کر بولی۔

"نہیں ہم نے بالکل بہت اچھا نہیں کیا' تمہاری شادی میں اڑچن ڈالنے کا ہمیں کوئی ادھیکار نہیں۔" ہرا پھرا کر بڑے سرکار اوشا کو مغالطے میں ڈالتے رہے۔ اوشا رانی کانٹا نگلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپتی رہیں بالکل فٹ بال کی طرح وہ اس کے جذبات سے کھیلتے رہے۔ یوں کسی کو تڑپا کر وہ شاید اپنے تڑپنے کا انتقام لینا چاہتے تھے۔

"روپے کیش دے دو اور یہ کاغذات بھی لیتی جاؤ۔ کہہ دو۔ جو مناسب ہے کریں' میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ ذرا سی بات پر غصہ آ جاتا ہے۔ جب جی بھر گیا تو انہوں نے بڑی لاپرواہی سے اوشا کو ٹال دیا۔

"ہے بھگوان! میرے پران ناتھ کتنے مہان ہیں۔ ہائے کوئی نوکر کو مار کر بھی یوں پچھتاتا ہو گا اور وہ منشی جیسا سور نوکر جس کے منہ میں لگام ہی نہیں۔"

اندر جب اوشا رانی منشی جی کے بارے میں بڑے سرکار سے حکم لانے گئی تھیں تو منشی جی ٹلے نہیں تھے' دروازے پر کان لگائے کھڑے تھے۔ بڑے سرکار کا فیصلہ سن کر انہوں نے فضا کو ایک موٹی سی گالی دی اور آپ ہی آپ مست ہو کر ناچ اٹھے۔ اوشا باہر آئیں تو انہوں نے بڑی سنگین صورت بنا کر کہا:

"رانی جی ہماری سزا؟"

اوشا نے ایک قہر آلود نگاہ ان پر ڈالی اور بھنا کر چل دیں۔

منشی جی ہر دم اوشا کی جوانی میں گھن لگنے کا ماتم کیا کرتے تھے۔ خود بھی کنوارے تھے اور زندگی کے سونے پن کا مزہ جانتے تھے۔ بڑے سرکار کے ہم سن تھے۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ کبھی کسی نے شادی میں دلچسپی ہی نہ لی۔ ساری عمر کی کمائی کوڑی کوڑی جمع تھی۔ اوشا رانی کو دور ہی دور سے تاڑ لیا کرتے تھے مگر ایک دن بڑے سرکار کی باتیں سن کر ہمت بڑھ گئی۔

ماسی حسب معمول ان کی آرتی اتارنے کے بعد تھالی نوکرانی کو سنبھلا کر وہیں بیٹھ گئیں اور بولیں:

"بیٹا اوشا رانی کی عمر نکلی جا رہی ہے، میرے لال اس کی لگن کا کچھ سربندھ کرو۔"

"ضرور ضرور، دیر نہ کرنا چاہئے۔ آپ کا اپنا گھر ہے، جیسے من چاہے کیجئے۔ لڑکا کیسا ہے؟ کتنا جہیز مانگتے ہیں؟ پیسے کا منہ نہ کیجئے گا، بر اچھا ہونا چاہئے۔"

"مگر---- مگر بیٹا---- تمہاری ماں کو بڑا ارمان تھا کہ وہ گھر ہی میں رہے۔" چاچی نے گھگیا کر کہا۔

"تو میں کب کہتا ہوں، گھر میں نہ رہے۔ دکھنی اور کے سارے کمرے خالی پڑے ہیں، بڑے شوق سے گھر جوائی ہی رکھیے۔ کیا کرتا ہے لڑکا؟"

چاچی سے برداشت نہ ہو سکا، پھوٹ کر رو پڑیں۔

"بیٹا تم ہی ہو اوشا کے سب کچھ، میں تو تمہاری آس لگائے بیٹھی ہوں۔"

"اوہف، چاچی مجھ سے بڑی بھول ہوئی اور دیکھئے نا میں تو اس قدر نکما واقع ہوا ہوں نہ کسی سے ملنا نہ جلنا۔ اوشا رانی کے لئے بر ڈھونڈنا معمولی بات نہیں، اچھا نیک آدمی ہونا چاہئے۔ اچھا چاچی منشی جی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

بڑے بھیا اس صفائی سے کترا کر نکل گئے کہ چاچی ہکا بکا رہ گئیں

"منشی؟ یہ گھوڑا دو کوڑی کا گنوار! کیا یہی میری بچی کے نصیب کا رہ گیا ہے؟ اس سے تو کنوئیں میں جھونک دوں؟ میری لکشمی سمان بیٹی جس کے چرنوں میں جائے گی اس کے بھاگ جاگ اٹھیں گے۔ بیٹا اوشا کو اس گھر سے جو لگاؤ ہے وہ کسی سے چھپا نہیں۔ کیا گھر کو بنایا سنوارا ہے۔ یہی اس کا گھر ہے، اس لئے بیٹا۔"

"جانتا ہوں چاچی۔ اچھا آپ فکر نہ کیجئے بھگوان نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا، ذرا بوائی ختم ہو لے۔ اس سال بارش کے کچھ اچھے تیور نظر نہیں آتے۔"

ارے منشی جی؟ انہوں نے بات کو پھر کمبل میں لپیٹنا شروع کیا۔

منشی جی، جو کھڑے کن سوئیاں لے رہے تھے، فوراً ٹپکے:

"جی سرکار! انہوں نے بالکل دولہاؤں کی طرح شرما کر کہا۔

"ذرا دیکھئے تو وہ نیا ٹریکٹر ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ عالی کمبخت بڑا گاؤدی ہے، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے، بڑا ست ہے۔"

"ست نہیں، سرکار ڈرتا ہے۔ کہتا ہے دھرتی کی چھاتی اتنا بھار سہارے گی تو پھر کلے کیسے پھوٹیں گے۔"

"کیا بکواس ہے۔ اور ہل بیل میں بوجھ نہیں ہوتا؟ احمق کہیں کا---- منشی جی۔"

"جی سرکار!"

"تمہاری نظر میں کوئی لڑکا ہے؟"

"جی سرکار، لڑکا؟ اوپر کے کام کے لئے؟" منشی جی چکرا گئے۔

"اماں نہیں، اوپر نیچے کے کام کے لئے نہیں، شادی کے لئے۔ اوشا رانی۔"

چاچی نے پوری بات نہ سنی اور دھم دھم کرتی چل دیں۔ بڑے سرکار کا جی کھل اٹھا، اطمینان کی سانس لے کر مسکراہٹ کو چھوٹ دے دی، مگر منشی جی کو مسکراتا دیکھ کر ایک دم روکھی خرانٹ شکل بنالی: "فرمایئے؟"

"جی---- جی سرکار!" منشی جی سٹپٹائے۔

"کیا کام ہے؟"

"جی، وہ حضور نے ہی تو بلایا تھا۔"

"اوہ، میں نے بلایا تھا تو اس کے یہ تو معنی نہیں کہ ایک بار آنے کے بعد آپ مستقل میرے سر پر ہی ڈٹے رہیں۔ چہ خوب!"

منشی پٹے کتے کی طرح رپٹا۔ بڑے سرکار اسی میں بڑائی سمجھتے تھے۔ ہر کسی کو نیچا دکھانے کے بعد وہ خود کو بہت اونچا سمجھنے لگتے تھے۔ دنیا کو پیروں تلے مسل کر ہی انسان بلند ہوتا ہے۔ ان کے دل میں چاچی کی طرف سے کرودھ بھر گیا تھا۔ چاندنی سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی، یونہیں انہیں عورت بغیر زندگی بنجر لگنے لگی تھی، سوچا اوشا رانی نہیں تو یہ لونڈیا ہی سہی۔ تھی تو تلچھ، گھوڑے پر دیویوں کے بچے نہیں پڑے ملتے، مگر خیر تھی عورت ذات مگر آج کے واقعے نے تو ان کے شبہات کو پختہ کر دیا۔

"ہائے رام! نہ جانے کیا! ہونے والا ہے۔ اس حویلی میں۔ کیا سورج اور چاند ٹکرائیں گے؟ بڑے زور کا دھماکا ہو گا۔ یہ لڑکی ضرور منیہ کی بھانجی بھتیجی رہی ہو گی جو وشوامتر سمان بڑے سرکار کے، تپ کا سروناش کرنے آئی ہے۔ کہاں وہ دیوتا اور کہاں یہ کلٹنی!"

"دہت تیرے دیوتا کی ایسی تیسی۔" انہوں نے ادھر ادھر دیکھ کر منہ ہی منہ میں جانے کسے کسے بہت ساری مغلظات سنا ڈالیں۔

چاچی کو' بڑے سرکار کو اور زندگی پھیکی سیٹھی تنہائی کو!

"نہیں نہیں بھو رانی مجھے شرم آتی ہے۔"

"ہٹ پگلی' شرم کاہے۔" بھو نے چاندنی کا پیار سے سر ہلا کر کہا۔

"مگر میرے جنم دن کا کوئی پتہ بھی تو نہیں۔"

"بس جس دن تو ہمیں ملی تھی وہی تیرا جنم دن ہوا۔ یاد بھی نہ ہو گا۔ تجھے اوشا دیدی نے کیسے جھما جھم کپڑے سئے تھے تیرے لئے۔ تب سے کوئی سال ایسا نہیں گزرا جو تیرا جنم دن نہ منایا گیا ہو' پھر اب کیوں نخرے کر رہی ہے؟"

"بس اچھا نہیں لگتا۔ میرے ساتھ کتنا سلوک ہوا ہے' کیا وہ کچھ کم ہے؟"

"چاندنی تو بڑی ذلیل ہے' ہر وقت پالنے کا طعنہ دیا کرتی ہے۔ آخر مجھے بھی تو اسی گھر میں پالا گیا ہے' چندر اور میں تو ہر وقت پالنے کا رونا نہیں روتے۔"

"تم تو اس گھر کی سنتان ہو۔"

"اور اوشا دیدی؟"

"وہ تو اتنے بچپن سے دس جانوں جتنا کام کرتی ہیں' میں نکمی ہوں۔"

"وہ کام کرتی ہیں تو کس پر احسان کرتی ہیں۔ بڑے بھیا سے ان کی شادی ہونے کے بعد وہ بالکل ہی مالکن بن جائیں گی۔"

"ہاں' رام کرے ان کا جلدی سے بڑے سرکار سے بیاہ ہو جائے۔" چاندنی گڑگڑا کر دعا مانگنے لگی۔ "میں تو روز گوری میا کے آگے ماتھا ٹیک کر یہی پرارتھنا کرتی ہوں۔"

"اور اپنے بیاہ کے لئے پرارتھنا نہیں کرتی۔ اچھا ٹھہر جا چھوٹے بھیا سے کہوں گی چاندنی رتی بھر پریم نہیں کرتی۔"

"ارے واہ' کرتی کیوں نہیں۔"

"رام رام' کیسی نرلج ہے' نگوڑی میرے سامنے کیسے منہ پھاڑ کر کہہ رہی ہے کہ میرے بھیا پر مرتی ہے۔"

"چل ہٹ' میں کیوں مرتی؟"

"مگر وہ تو مرتا ہے تیرے پہ----"

"دیکھو بھو مجھے نہ ستائے جا- اپنی کہہ' دن دن بھر بیٹھ کر پرکاش جی کو چٹھیاں لکھی جاتی ہیں تو-"

"اونہہ' سات سمندر پار والوں کا کیا بھروسہ! وہیں کسی سے دل لگا بیٹھے تو؟" بھو کی پچھلے سال ایک ڈاکٹر سے منگنی ہو چکی تھی جو انگلینڈ گیا ہوا تھا---- "ہٹا میرے قصے کو' تو نے چھوٹ بھیا کو ہار کے لئے یاد دلایا؟"

"ارے وہ بیچارے کہاں سے لائیں گے؟ رام جانے کتنا منگا ہو گا؟"

"تو کیا ہوا' اس کی گھر والی کے پاس تو رہے گا-"

"دیکھ مجھے مت ستا- میں رو دوں گی بھو-"

"کیوں؟ چندا کی چاندنی کہاں جائے گی اور-"

"مرجائے گی کمبخت- چاندنی منہ اوندھا کر پڑ گئی-

مگر چندر بوکھلایا پھر رہا تھا- ڈھائی سو کے ہار کی فرمائش پوری کرنا کھیل نہ تھا- مگر جائیداد میں اس کا بھی تو حصہ تھا- بھیا انکار تھوڑی کریں گے! مگر چاندنی کے لئے مانگتے اسے شرم آ رہی تھی- اس نے اوشا دیدی سے مانگے' ان کے پاس مشکل سے سو نکلے- پچاس ساٹھ خود اس کے پاس پڑے تھے- ڈیڑھ سو سے کام نہیں چلے گا'

مجبوراً بھیا کے پاس جانا پڑا-

"بھیا کچھ پیسے مل جائیں گے؟" اس نے ان کی پیٹھ کے پیچھے کھڑے ہو کر پوچھا-

"پیسے؟" "جی روپے"

"کتنے روپے-"

"یہی دو ڈھائی سو-"

"ایسی کیا ضرورت آن پڑی-"

"وہ میں نے ٹینس کا ریکٹ منگوایا ہے' بلّی چھڑانا ہے----اور"

بڑے سرکار چندر کے جھوٹ پر تلملا گئے- انہوں نے اپنے کانوں سے ہار کے بارے میں کھسر پسر سنی تھی- بھو کہہ رہی تھی- اگر اس نے ہار لا کر نہ دیا تو چاندنی اس سے عمر بھر بات نہ کرے گی- خیر عمر بھر کی بات تو دور رہی اگر چند دن کو بھی یہ ہنسی اور قہقہے' یہ کونے کھتروں کی چوما چاٹی میں اڑچن پڑ جائے تو برا نہیں-

میرے پاس تو دس بارہ روپے ہیں' اب بینک بھی بند ہو گیا-" انہوں نے رکھائی سے جواب دیا-

چندر پسینہ پونچھتا بھاگا-

اس کے جانے کے بعد وہ بڑے اطمینان سے اٹھے- لگان کے روپیوں کی گڈیاں سیف میں اٹا اٹ بھری تھیں- موٹی سی نوٹوں کی گڈی جیب میں ڈالی اور دنیت ہلائے پروقار انداز میں باہر نکلے- ڈرائیور سے موٹر نکلوائی اور چل دیئے-

چندر سر پکڑ کر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا- کیا کرے؟ بھو تو کوڑی نہ دے گی' بہت دنگا کرے گی- پھر چاندنی کو پتہ چل جائے گا کہ وہ چندہ کر کے ہار لا رہا ہے تو روٹھ جائے گی- ویسے وہ تو خود منع ہی کرتی رہی' بھو نے ہی زور ڈالا کہ چاندنی کے پاس کوئی سچا زیور ہی نہیں' بھویا اوشا دیدی زبردستی تیج تہوار پر پہنا دیتی ہیں تو ان کا زیور پہن لیتی ہے- اسے بھو نے چڑا کہ وہ بھی مردانگی دکھانے پر تل گیا' اب اگر ہار نہ آیا تو بڑی بھد ہو گی-

بھو بن سنور کر ڈانس ماسٹر کے ہاں جا رہی تھی' چندر نے اسے سیڑھیوں پر پکڑ لیا:

"ارے بھو جی آج تو کمال کر دیا-"

"کس نے؟"

"جادوگر نے-"

"جادوگر؟"

"ہاں جی' کالج میں آیا تھا میں نے اس سے سیکھ لیا"

"اچھا؟" بھو چلنے لگی-

"جادو دیکھے گی؟"

"نہیں بابا"

"کیوں گدھی؟" چندر بگڑنے لگا-

"ارے بھئی ہمارا تانگہ کھڑا ہے' دیر ہو جائے گی-"

"بس دو منٹ میں-" بھو کو اس نے گھسیٹ کر سیڑھی پر بٹھا لیا-

"چل نوٹ نکال-"

"ہائے نہیں-"

"ارے نکال تو ایک کے دو بنا دوں گا-"

ہمو نے بڑی مشکل سے ایک روپیہ والا نوٹ نکالا۔

"چل' چل کالی کلکتے والی' تیرا وار نہ جائے خالی' انٹ سنٹ بجلی بسنت۔۔۔۔ لے پھونک مار۔" ہمو نے پھونک بڑے تکلف سے ماری چندر نے مٹھی کھولی تو ایک کی جگہ دس کا نوٹ تھا۔ ہمو کی چیخیں نکل گئیں۔

"ہئی ہے چندرو بھیا!"

"لا جلدی جلدی بنوا لے۔"

"بس بھئی اب نہیں بنوانے۔" ہمو نے اطمینان سے نوٹ بٹوے میں رکھ لیا اور چلی۔

"ارے رے' بھاگتی کہاں ہے؟" چندرو نے اسے پھر گھسیٹ کر بٹھا لیا۔ "پھر پیتائے گی قسم سے' چل جھٹ پٹ نکال۔" چندر نے چٹکی بجائی۔

ہمو نے دس کا نوٹ نکالا۔

"اونہہ کیا مر مر کر نکال رہی ہے۔ اب کون بیٹھ کے دس دس کے نوٹوں پر منتر پڑھتا پھرے۔ سو کا نکال ہزار بنا دوں گا۔"

"ہاں؟"

"ہاں؟"

"ہزار!"

"اور کیا' جو ہزار کا ہو تو دس ہزار۔"

"ہزار کا تو نہیں۔"

"اچھا لا سو کا نکال۔" نوٹ لے کر چندر نے زور زور سے منتر پڑھنے شروع کیے: "کالی کلکتے والی' چل چال' لے پھونک مار' ٹھیک سے ماریو کیا پھوپھو کر رہی ہے۔ دیکھ بھئی الٹی سیدھی پھونک ماردی تو ایک دم معاملہ بگڑ جائے گا۔

"پھووں۔۔۔۔" ہمو نے سارے کلیجے کا زور لگا کر پھونک ماری' چندر نے مٹھی کھولی تو پرانے اخبار کا ٹکڑا نکلا۔

"دیکھا!"

"ہائے رام' میرا سو روپے کا نوٹ۔"

"تو میں کیا کروں؟ گدھیا سے کہہ رہا ہوں ٹھیک سے پھونک مار' بھئی ٹھیک سے پھونک مار مگر۔۔۔۔" چندر غرایا۔

"میں نہیں جانتی' میرا نوٹ لاؤ۔"

"آہاہا' خود ہی تو الٹی سیدھی پھونک مار دی' اب جادو الٹا پڑ گیا تو میں کیا

کروں؟ مجھے دیر ہو رہی ہے' چل ہٹ۔" وہ اسے دور جھٹک کر چلنے لگا۔

"ہائے میا میں مر گئی۔ ڈانس ماسٹر کی فیس کہاں سے دوں گی؟ لاؤ چور کہیں کے میرا نوٹ' لو یہ اپنا دس کا نوٹ۔"

"ارے تیرے سامنے جادو کیا اور اب ایسی باتیں کر رہی ہے۔ ارے بھئی یہ تو جادو ہے' کبھی سیدھا پڑ گیا تو کبھی الٹا۔" اس نے بڑی بھولی صورت بنا کر کہا۔ وہ دس کا نوٹ بھی لے لیا۔ گھبرا نہیں ہمی' میں ذرا کام سے جا رہا ہوں' ابھی واپس آ کر تیرے سارے روپے دس گنا بنا دوں گا۔"

"ارے جا سور' اب تیری چالوں میں کون آتا ہے' وہ چندر کی چالیں خوب سمجھتی تھی۔ مگر وہ سیدھی طرح مانگتا تو کبھی نہ دیتی۔

حویلی برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ سب جانتے تھے چاندنی کی سالگرہ کا تو بہانہ ہے، ان حویلی والوں کو اور کچھ نہیں تو کتے کتیا کی سالگرہ منانے کی سوجھ جاتی ہے۔ زندگی کی نااہلیت اور اکتاہٹ پل بھر کو کم ہو جاتی ہے، کچھ ہنگامہ ہو جاتا ہے، اوشا دیدی کو اپنا سگھڑپا دکھانے کا چانس ہی مل جاتا ہے جو ماضی کے حسابوں بڑے سرکار پر رعب ڈالنے کے لیے اچھا طریقہ ہے۔

چاندنی بے قرار چندر کے انتظار میں کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ کھڑکی سے اس نے اس کی سائیکل کو پھاٹک کی طرف مڑتے دیکھا تو دیوانوں کی طرح گرتی پڑتی بھاگی۔

"چندرو جی، میری مالا!" وہ اس کا اداس لٹکا ہوا منہ دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔

"کیا ہوا؟" اس نے سہم کر پوچھا۔

"بک گیا ہار تو۔"

"ہار بک گیا۔"

"ہاں کوئی گھنٹہ بھر پہلے، مگر اس سنار نے وعدہ کیا ہے۔ بالکل ایسا کا ویسا ہار پندرہ دن میں۔"

"ہنہ، پندرہ دن میں۔" وہ روہانسی ہو کر جانے لگی۔

"سن تو چنو۔"

"نہیں سنتی۔" وہ چنگھاڑی "اتنے دن سے کہہ رہی تھی کہ بک جائے گا مگر "نہیں گے۔"

دوسرا بن جائے گا---- تو----"

"مجھے نہیں چاہیے دوسرا تیسرا چوتھا پانچواں۔ تم لائے تو قسم سے پتھر سے کچل کر پھینک دوں گی۔"

"چندرا رانی۔"

"خبردار جو مجھے چندرا رانی کہا۔ میں رانی نہیں گھورے پر پھینکی ہوئی اناتھ

چھوکری ہوں۔ رانی ہوتی تو مجال تھی جو تم میرے لیے ہار نہ لاتے۔ وہ، جس کے لیے کوئی ہار لے گیا ہے، وہی رانی ہے۔" اس کے گالوں پر لمبے لمبے آنسو بہنے لگے۔

بڑے سرکار نے یہ حسین ڈراما دیکھا اور کھل اٹھے۔ کسی نے ان کی چھچھوری مسکراہٹ نہ دیکھی۔ گھنٹے بھر سے وہ ہار کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔

ہر سال وہ منشی جی کے ذریعے ہر کسی کی سالگرہ پر روپے دلوایا کرتے تھے۔ وہ چاندنی کو ہار کیسے دیں؟ گھنٹوں ٹہل ٹہل کر وہ منصوبے باندھتے رہے۔ کیا کہیں گے؟ کیسے کہیں گے؟ سب کے سامنے دیں۔ یا اکیلے میں؟ بس وہ تو ایک بار اس کے چہرے پر وہ مسکراہٹ دیکھنا چاہتے تھے جو ہار کو پا کر اس کے ہونٹوں پر مچلنے لگے گی۔

چندر جو انہیں پتا سمان سمجھتا تھا جسے وہ جان سے زیادہ چاہتے تھے، اسے زکام ہو جاتا تو بے چین ہو اٹھتے------ انہیں اس سے کتنا لگاؤ تھا! اور کتنی نفرت تھی! وہ سوتے جاگتے اس کی موت کا خواب دیکھا کرتے! چندر گھوڑے پر سے گر پڑا ہے، اس کا بھیجا پاش پاش ہو گیا ہے، انہوں نے غم سے نڈھال چاندنی کو اپنے پیاسے ہونٹوں سے لگا لیا ہے اور---- اور پھر آنکھ کھل جاتی! حلق خشک، پسینے میں شرابور وہ تھک کر ہانپنے لگتے۔ کتنی بار انہوں نے تخیل میں چندر کو قتل کر دیا؟ اس کی خون میں ڈوبی لاش کو روندتے ہوئے وہ حجلہ عروسی میں داخل ہو گئے اور---- اور پھر آنکھ کھل جاتی، ان کا دل خون میں ڈوب جاتا، وہ بے قرار ہو کر ہچکیوں سے رونے لگتے۔ چندر---- ان کا ننھا منا بھائی!

"میرے لال چندر اور بہو کے تم ہی پتا ہو اور تم ہی ماتا۔ انہیں دکھ نہ دینا، نہیں تو میری آتما جنم جنم تک بھٹکتی پھرے گی۔" ماں نے مرتے سمے کہا تھا اور اس دن سے انہوں نے اپنا بچپن تیاگ کر بڑھاپے اور ذمہ داری کا کانٹوں بھرا چولا پہن لیا تھا۔ مگر قدرت ان کا کھیل مٹھونے پر تل چکی تھی، ایک انجانی طاقت انہیں کٹھ پتلی کی طرح نچا رہی تھی، ساری عمر کی نیکی اور پارسائی ایک ہی وار میں بھسم ہو جا رہی تھی۔

راتوں کو وہ ڈراؤنے خواب دیکھ کر چونک پڑتے۔ روشنی جلا کر اپنے ہاتھوں اور کپڑوں پر خون کے نشان ڈھونڈتے۔ پھر بھی جی ٹھنڈا نہ ہوتا تو چندر کے کمرے میں جا کر اسے دیکھتے، کہیں زخم تو نہیں، سانس تو چل رہی ہے۔ اسے زندہ اور صحیح سلامت پا کر بے اختیار ان کی ممتا جاگ اٹھتی۔ اچھی طرح کمبل اڑھاتے، مچھردانی

چاروں طرف دبا دیتے کبھی چندر کی آنکھ کھل جاتی تو وہ ان کی ہنسی اڑاتا۔ "واہ بھیا' کوئی میں بچہ ہوں۔"

"ترائی میں ملیریا پھیل رہا ہے' تم احتیاط نہیں کرتے۔"

جب دونوں بھائی پاس پاس بیٹھ جاتے' چھوٹے چھوٹے پیار کے جملے کہتے' ماں باپ کی محبت کو یاد کرتے اس وقت چاندنی ان کے درمیان سے دور ہوتی اور وہ چندر کے شاندار مستقبل کے پلان بناتے' بہو کی شادی کے اخراجات کا حساب لگاتے' بڑی فیاضی سے اسے روپے دیتے' جیسے اپنے لگائے زخموں پر مرہم لگا رہے ہوں' حالانکہ وہ سارے زخم کچھ ان کے دل پر کم گہرے نہ تھے۔

مگر اس وقت چندر کی ہار اور اپنی جیت کا دلچسپ ڈراما دیکھنے کے ملیے وہ ایک کمسن بچے کی طرح بے قرار تھے۔

مگر جب وہ ہار لے کر نیچے ہال میں پہنچے تو منظر ہی کچھ اور تھا۔ گھڑی بھر پہلے کی بپھری ہوئی چاندنی چندر کی بانہوں میں پگھل رہی تھی۔

"چاند راجہ' میرے گلے کا ہار تو تیری بانہیں ہیں۔ تھو ہے ہار پر میں بھی کتنی بدھو ہوں۔ واہ چندن راجہ ایک دن مجھے ہیروں جڑی مالا پہنائے گا' کیوں؟ ہے نا؟"

"مگر میں نے آج تک تجھے کچھ بھی تو نہیں دیا۔" چندر شرم سے گردن جھکائے تھا۔

"تو نے مجھے جیون کا سہارا دیا پگلے۔ تو نے مجھے وہ دیا جو بھگوان نے چھین لیا تھا۔ یہ گھر' سکھ چین' بہو جیسی گوئیاں ---- اور کیا چاہیے مجھے؟ اور تو جب ایسے دیکھتا ہے مجھے تو میرے من میں موتیوں کی پھوار ہونے لگتی ہے۔ میری طرف مت دیکھ چندر۔" اس نے چندر کی آنکھوں پر ہتھیلی رکھ دی۔

ایک الاؤ بڑے سرکار کے وجود پر دہک اٹھا' جنگلی بھینسے کی طرح ان کے سانس کی دھونکنی چلنے لگی' آنکھوں میں زہر میں بجھی سلائیں کنپٹیوں کو چیرتی چلی گئیں' ہار سانپ کی طرح انگلیوں کو ڈسنے لگا۔ اس سے قبل کہ وہ وحشی درندے کی طرح اپنے رقیب پو ٹوٹ پڑتے کسی کے پیروں کی چاپ سن کر وہ جاگ پڑے۔

اوشا رانی سولہ سنگھار کیے زینے پر سے اتر رہی تھیں۔

"اوشا!" انہوں نے اپنے حلق کی ساری تلخی کو پی کر نہایت میٹھے سروں میں پکارا۔

"آہ! اپنا نام ان کے ہونٹوں سے سن کر جیسے اوشا کی چھاتی پر دھائیں سے گولی

لگی' وہ کلیجہ تھام کر بولیں۔ "جی۔"

"ذرا ادھر آیئے۔" وہ اس کی تڑپن سے لطف اٹھاتے ہوئے شرافت سے بولے۔

اوشا کی جان کھینچنے لگی۔ نئی دلہن کی طرح ہولے ہولے قدم اٹھاتی وہ ان کے پاس پہنچیں۔ ہے بھگوان' آج انہوں نے پکارا!

"دیکھیے تا ہم آپ کے لیے کیا لائے ہیں؟"

"میرے لیے!"

"جی' حقیر سا تحفہ ہے۔" انہوں نے ہار اس کی آنکھوں کے سامنے نچایا۔

"میرے جیون کا سب سے سندر سنگھار ہے۔" انہوں نے دبی زبان سے کہا اور دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔

"اوہنک' ہم خود پہنائیں گے۔"

"ارے یہ ہار آپ لے آئے؟" چندر نے چاندی کے منع کرنے سے پہلے کہہ ڈالا۔

"ہاں' کیوں؟ کیا پسند نہیں۔"

"جی نہیں' میرا مطلب ہے' جی ہاں۔" چندر نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

اتنے میں ماسی آگیں اور ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"جیو مرے لال۔ جگ جگ جیو۔ میری عمر بھی تمہیں کو لگ جائے۔" انہوں نے بڑے سرکار کی بلائیں لے کر کہا اور اوشا کو گلے لگا کر ایسے پھوٹ کر رو دیں جیسے ڈولا تیار ہو چکا ہے اور وہ اپنی سسرال جا رہی ہو۔

غصے اور نفرت کا ایک بے پناہ طوفان بڑے سرکار کے دماغ میں گونجنے گرجنے لگا مگر وہ ضبط کر گئے۔

"ہاں' اوشا جی' منشی سے کہنا چاندی کو جنم دن کے کتنے روپے دیئے تھے گئے سال' بس اتنے دے دیں۔" بڑے خشک لہجے میں انہوں نے حکم دیا اور لائبریری میں چلے گئے۔

"ہمیں نہیں چاہیئں روپے۔" چاندنی پھنکاری۔ تھوڑی دیر کے لیے دونوں مرجھا سے گئے' پھر سب کچھ بھول بھال کر سالگرہ کے اودھم میں لگ گئے۔ لان پر نوجوان لڑکے لڑکیاں اودھم جوت رہے تھے۔ فضا قہقہوں کی جھنکار سے گونج رہی تھی۔ اوشا رانی کی آنکھوں میں آج نرالی ہی جوت جگمگا رہی تھی۔ وہ بار بار گلے

میں ہار کو چھوتیں اور پھر خود ہی شرمانے لگتیں۔

ماسی کی عجیب حالت تھی۔ ایک طرف تو وہ چاندنی کے ٹھاٹ دیکھ کر سلگ رہی تھیں، دوسری طرف خوش تھیں کہ چندر بالکل ہی چھوکری پر اتارو ہو چکا ہے۔ شادی کر لے تو بڑے سرکار جھٹ اسے جائیداد سے محروم کر دیں گے۔ مالک تو وہی ہیں، انہیں کے نام ساری پونجی جو تھی۔

بڑے سرکار اس ہنگامے میں بھی اکیلے تھے۔ ان کے دماغ پر گھن برس رہے تھے۔ مایوسی اور نامرادی کے بادل امڈ امڈ کر ان کا دم گھونٹے دے رہے تھے۔ دل کی ویرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ احمقوں کی طرح وہ چندر اور چاندنی پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ ان کی ہر شوخی پر ایک تازیانہ سا ان کے احساسات پر پڑتا اور وہ تڑپ کر رہ جاتے۔

ایک دم ان کی نظر گھاس پر پڑے ہوئے ہار پر پڑی جو اوشا کے گلے سے کھل کر سرک گیا تھا۔ جھک کر انہوں نے ہار اٹھایا اور اوشا کو دینے لگے۔ ایک دم نہ جانے کیا سوچ کر ٹھٹک گئے، گلا صاف کرنے کے بہانے وہ اٹھے، چاندنی کا بٹوہ میز پر پڑا تھا۔ اسے کھول کر ہار ڈال دیا۔

چاندنی مولسری کے پیڑ تلے سوکھے پتوں کے ڈھیر پہ بے سدھ پڑی تھی۔ جب کبھی اس کے دل کو کوئی بڑا بھاری دکھ چوٹ لگاتا تو وہ یہیں پتوں کے ڈھیر پر جا بیٹھتی۔ یہی پتے تو اس کا ماتکا تھے۔ چندر نے اسے یہیں پڑا پایا تھا۔ یہیں پڑی پڑی وہ پتوں کی طرح سوکھ جائے گی، پھر مالی ادھر کے جھانکڑ کی جھاڑو سے اسے سمیٹ کر باغ کے کوڑے کے ساتھ جلا دے گا، پھر اس کی راکھ فضا میں آہیں بھرتی جنم جنم تک اڑتی رہے گی۔

مگر پہلے جب کبھی وہ روٹھتی تھی تو چندر بے قرار ہو کر اسے منا لیتا تھا۔ اب کے اس نے چاندنی کو کوڑے کے ڈھیر پہ پڑا دیکھا تو انجان بن گیا، جانو وہ وہاں ہے ہی نہیں، وہ اتنی سنجیدگی سے کبھی نہیں روٹھا تھا۔

جب اوشا دیدی کا ہار اس کے بٹوے سے سارے مہمانوں کی موجودگی میں نکلا تو چندر مارے شرم کے زمین میں گڑ گیا۔ اس نے چاندنی کو اتنے زور سے سب کے سامنے طمانچہ مارا کہ اب تک گال سوج رہا تھا۔ اسے اپنی صفائی میں کچھ کہنے بھی نہ دیا۔

"کسی چور ڈاکو کی اولاد ہو گی موئی۔" ماسی نے مہمانوں سے تلاشی لینے پر معافی مانگتے ہوئے کہا تھا۔

"جانے دیجیے ماسی۔" بڑے سرکار انہیں روکتے رہے مگر وہ بھلا رکنے والی تھیں؟ خوب، جلی کٹی سناتی رہیں۔

"افوہ، جانے دیجیے۔ انسان سے بھول ہو ہی جاتی ہے۔ اوشا رانی اب یہ ہار نہ پہنیے۔" بڑے سرکار بولے۔

"کیوں؟" اوشا کانپ اٹھیں۔

"جسے پسند ہے اسی کو دے دیجیے، ہم آپ کو دوسرا لا دیں گے۔"

"کیوں دے دے۔ بڑی آئی پسند کرنے والی۔ اسے صدقے کروں مری کو۔ ہمارے ٹکڑوں پر پلی اور ہم سے بیر باندھتی ہے۔"

"ماسی جی چاہو۔ جیسی قسم لے لو میں نے ہار کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔" چاندنی شرم سے لرز کر رونے لگی۔

"اری چل کلموڑی' تیرا مرا جیتا ہے کون جس کی قسم کھائے گی؟ کوئی ہوتا تو یوں کوڑے پر پھینک جاتا؟ اری میری بیٹی سے تو نے کس بات کا بیر نکالا؟ اری میری بیٹی نے اس کتیا کے سگی بہن سے زیادہ دلار کیے' جنم دن کا سارا انتظام کیا' ہاتھ سے موتی کو ہیشہ سی پرو کر سجایا اور اس نے یہ بدلا دیا۔"

"چاندنی!" ہمو سسکیوں سے رو پڑی تھی' "تجھے یہ ہار اتنا پیارا تھا کہ چوری سے بھی ڈر نہ لگا۔ چھوٹ بھیا!" دوڑ کر چندر سے لپٹ گئی۔

چندر نے آنسو بھری آنکھوں سے چاندنی کی طرف دیکھا' وہ کٹ کر رہ گئی۔

"چندر تمہیں میرے اوپر وشواش نہیں۔"

اور چندر نے بھرپور طمانچہ اس کے منہ پر جڑ کر اسے اپنے سے دور دھکیل دیا۔

"بھئی تم لوگ خواہ مخواہ اتنی سی بات کا بتنگڑ بنا رہے ہو۔ ہار پسند تھا لے لیا تو ایسا کون سا غضب ہو گیا؟ چندر تم زیادتی کر رہے ہو۔" بڑے سرکار نے اور آگ پر تیل چھڑکا' جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ چاندنی پر اور گالیاں پڑیں۔

"بھئی کسی کو ہار اتنا پسند ہو کہ وہ چوری تک کر بیٹھے' ایسا ہار میں اوشا رانی کو دینا نہیں چاہتا' دے دو اسی کو اوشا۔"

"اوہ' میری جان بھی چلی جائے تب بھی میں یہ ہار کسی کو نہیں دوں گی۔" اوشا نے گھٹے ہوئے گلے سے کہا' جیسے ہار نہیں کوئی ان سے ان کا سہاگ مانگ رہا تھا۔

"وہاں جی کا ہے کو دیوے ہار۔ کل کو یہ کسی کی جان مانگیں گی تو کماری جی کے لیے جان بھی دے دے گا۔" ماسی غرائی۔ پارٹی درہم برہم ہو گئی۔ لوگ کھسیانے سے جلدی جلدی رخصت ہو گئے۔ گھر میں ایسا معلوم پڑتا تھا۔ جیسے غم ہو گئی ہو۔ چندر کے لاڈلے دل کو کبھی اس سے زیادہ بھاری صدمہ نہیں پہنچا تھا۔ چاندنی کے لیے تو جینے کا بہانہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ چاند پر گھنگھور گھٹائیں چھا جائیں تو پھر چاندنی کیوں نہ سسک کر دم توڑ دے!

"کیا چاندنی چور ہے؟ تو پھر میرے زیور میز پر پڑے رہتے ہیں کیوں نہیں چراتی؟" ہمو نے بحث کی۔

"مجھے ذلیل کرنے کے لیے اس نے چوری کی۔" چندر نے تھوک نگل کر کہا۔

"جل ککڑی بہت ہے' کسی کی خوشی نہیں دیکھ سکتی' میرا دل دکھانا چاہتی تھی۔" اوشا بسوریں۔

"نہیں جی تم اس کمینی کو نہیں جانتیں۔ اصل میں بڑے سرکار سے جلتی ہے۔ اس کا بس چلے تو ساری جائیداد چندر کے نام کروا دے۔ وہ اس کے تلوے چاٹتا ہے نا۔" ماسی نے اور زہر اگلا۔

بس ایک بڑے سرکار تھے جنھوں نے ایک لفظ چاندنی کے خلاف منہ سے نہ نکالا۔ وہ مہا پرش جو تھے! کتنی دیا تھی۔ ان کے دل میں! وہ برابر یہی کہہ رہے تھے!

"اتنی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا' یہ زیادتی ہے چندر کی۔"

وہ دیوتا تھے۔ شما کرنا ہی تو بڑپن کی نشانی ہے۔ وہ جنہیں چاندنی اپنا سمجھتی تھی کتنے کچے نکلے اور جنہیں جانی دشمن سمجھتی تھی وہ دیوتا سمان اس کی بچ کر رہے تھے۔ ایک دم اس نے دل سے بڑے سرکار کے خلاف سارا میل دھل گیا۔ اگر وہ ان سے اتنا ڈرتی نہ ہوتی تو جا کر ان کے پاؤں کو پکڑ لیتی۔

"میرے سرکار میں نے آپ کو غلط سمجھا۔ میں پاپن ہوں' مجھے معاف کر دیجیے۔ جو چاہے سزا دیجیے پر چندر سے کہیے مجھے یوں بے موت نہ سکائے۔ میں مر بھی تو نہ سکوں گی اس کے پیار بنا۔"

ہائے جس گھر میں اس کے اتنے لاڈ ہوتے تھے آج لٹ کر اس کی طرف دیکھنا بھی کسی کو پسند نہ تھا۔ یہ بچپن کی شوخی بھر لڑائی نہیں تھی۔ ہمو نے کئی بار اس کے پاس آ کر بولنے کی کوشش کی مگر ماسی نے نے وہ شور مچایا کہ ہمت نہ پڑی اس کی۔

"چور نیچ ذات کی سنگت میں تیرا ناس لگ جائے گا۔" انہوں نے چنگھاڑنا شروع کیا اور اس کا پلنگ اٹھوا کر اوشا کے کمرے میں لگانے کی دھمکی دی' مگر اوشا کے کمرے میں ہمو کا دم گھٹنے لگا۔ کوئی چیز ادھر سے ادھر ہو جاتی تو غل مچانے لگتیں۔ وہ چاندنی سے دور رہ بھی نہیں سکتی تھی۔

"پر چاندنی سوریا تو نے ہار کیوں چرایا؟ جی چاہتا ہے تیرا بھرتا بنا دوں چڑیل۔" اس سے نہ رہا گیا۔ اس ڈانٹ میں کتنا پیار تھا! چاندنی رو پڑی۔

"ہمو رانی تیری قسم میں نے ہار کو ہاتھ بھی چھوایا ہو تو کوڑھ پھوٹے میں مر جاؤں' میرے دیدے پٹم ہو جائیں۔"

"نہ بھئی ایسی باتیں نہ کر۔ مگر یہ چندر کا بچہ بڑا نیچ ہے۔ اتوار کو پکنک کا

پروگرام تھا' سب چوپٹ ہو گیا- ہار نہ ہوا بلا ہو گیا کہ سارا گھر سونا پڑا ہے' جی اوب گیا-"

چاندنی سے ملاپ کر کے وہ سیدھی اوشا کے پاس پہنچی-

"ہاں؟"

"مجھے شما کر دو رانی دیدی-"

"کیسی شما؟"

"وہ تمہارا ہار تھا نا؟------ وہ میں نے چرایا تھا-" بھو نے آنکھیں مسل ما-

"تو نے چرایا تھا؟"

"ہاں- پھر----"

"پھر؟"

"پھر بٹوے میں ڈال دیا-"

"چاندنی کے بٹوے میں؟"

"اور کیا- میرا بٹوہ تو کمرے میں تھا-"

"چل جھوٹی-"

"ارے سچ' قسم سے پیاری دیدی-"

"بکواس نہ کر' تو کیوں چراتی ہار؟"

"ارے میں تو مذاق کر رہی تھی' چرایا نہیں-"

"پھر کیوں جھوٹ بول رہی تھی-"

"اٹھا لیا تھا- گھاس پر پڑا تھا- میں نے اٹھا کر بٹوے میں ڈال دیا- آپ ادھر میں نہیں اس لیے-"

"ہائے رام! تو جبھی تو نے بتایا کیوں نہیں-"

"وہ--- وہ مجھے ڈر لگا کہ کہیں سب مجھے چور نہ سمجھنے لگیں- ماسی اتنا غصہ کر رہی تھیں- میں ذرا باتھ روم گئی تھی' واپس آئی تو دیکھا چاندنی چور ہے-" بھو رونے لگی-

"چل جھوٹی- تو تو اس وقت خود چاندنی کو ڈانٹ رہی تھی-"

"ایں؟ تو پھر کیا کرتی؟ اوشا دیدی بس میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا-"

"ہائے رام یہ تو برا ہوا-" اوشا دکھی ہو گئی-

"اچھا چڑیل تو نے ہار چرایا اور چاندنی پر ڈانٹ پڑی- بتایا کیوں نہیں؟"

"وہ چاندنی مجھ سے جو دنگا کر رہی تھی صبح سے-"

"تو تو نے اسے پھنسا دیا! چل بھوتنی' چل بڑے بھیا کے پاس-" چندر نے اس کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹا- دیکھ تجھے کتنے جوتے کھلواتا ہوں-" وہ اسے مارتا دھکے دیتا لے چلا- بھو نے خوب ٹھوکریں ماریں' کاٹا اور پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی- مگر چندر نے اسے اٹھا لیا اور بورے کی طرح لے جا کر بھیا جی کے سامنے پٹخ دیا-

"یہ د- یکھیے بھیا اس چڑیل کے کرتوت-"

"چندر ہوش میں ہو کہ نہیں-"

"میں اپنے ہوش میں کیسے رہ سکتا ہوں؟ ہار اس نے چرایا اور الزام بے چاری چاندنی کے سر تھپ گیا-"

"پرمیلا یہ سب کیا ہے؟"

"بڑ بھیا میں نے وہ ہار تھا نا--- چرا کر-"

"تم بدھو ہو چھوٹ بھیا' تم بیچ میں مت بولو- بڑ بھیا میں نے ہار چاندنی کے بٹوے میں ڈال دیا-"

"جھوٹی-" بڑے بھیا زور سے گرجے' بھو کے آنسو چھلک پڑے-

"مگر بڑ بھیا یہ تو خود کہہ رہی ہے-"

"یہ جھوٹ بول رہی ہے-" بڑے سرکار کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے-

"نہیں بھیا یہ خود کہہ رہی ہے- آپ ہی سوچئے اور کون پاجی ہو سکتا ہے اس کے سوا؟"

"ہاں---- مگر------" بڑے بھیا کی آنکھیں جھک گئیں-

"معاف کر دیجئے بھیا- میں نے تو مذاق میں چھپایا تھا- مگر جب بات اتنی سیریس ہو گئی تو میں نے ڈر کے مارے نہیں بتایا-"

"بھو!"

جی بڑ بھیا-"

"یہاں آؤ میرے پاس-"

"جی بڑ بھیا!"

"جانتی ہو جھوٹ بولنا پاپ ہے-"

"مگر بڑے بھیا میں قسم کھا سکتی ہوں کہ چاندنی نے ہار نہیں چرایا۔"

"پھر کس نے چرایا؟"

"میں نے۔" اس نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا مگر اس کی شاف اور معصوم آنکھوں میں ذرا بھی جھجک نہ تھی۔

"نہیں۔"

"تو پھر کس نے چرایا؟"

"میں نے!" بڑے سرکار نے کہا۔

"آپ نے؟ اوہ۔" وہ زور سے قہقہ مار کر ہنسی' "جایئے بڑے بھیا بھلا آپ۔" اور وہ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئی۔

چندر نے جا کر چاندنی سے کہہ دیا کہ بمو نے اقبال جرم کر لیا ہے کہ ہار اس نے بٹوے میں ڈالا تھا۔

"بمو نے؟" چاندنی چونک پڑی۔

"ہاں' کیونکہ وہ تمہارے جنم دن پر جل رہی ہو گی۔"

"رام رام کیا کہہ رہے ہو چندر جی! بمو میری خوشی سے جلے گی؟ وہ تو خود میری خوشی ہے۔ بھگوان نے مجھے کچھ نہ دے کر بمو کو میرا بنا دیا' بس یہی بڑی سے بڑی دولت ہے۔"

"ارے وہ بڑی بدذات ہے چڑیل۔"

"نہیں نہیں' وہ جھوٹ بول رہی ہے۔"

"ارے واہ! اس میں اسے کیا مل جائے گا؟ بیکار ڈانٹ کھانے کو۔"

"کیوں کہ ---- تم نہیں پہچانتے چندر جی ---- کیونکہ وہ بالک کی طرح نرم دل اور بھولی ہے اس نے سارا دوش اپنے سر لے لیا۔"

"تو کیا ---- تمہارا مطلب ہے ہار اس نے نہیں بلکہ تم نے خود۔"

"نہیں' میں نے ہار نہیں چرایا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تم نے تو مجھے چور مان ہی لیا اور سزا بھی دے دی۔ اب چھان بین سے کیا فائدہ؟"

"چاندنی؟"

مگر چاندنی منہ پھیر کر چلی گئی۔

"سنو تو چاندنی۔" چندر نے اس کا بازو پکڑا مگر اس نے دور جھٹک دیا۔

"کیا مجھ سے ساری عمر بات نہ کرو گی؟"

"نہیں۔" چاندنی ہونٹ کاٹنے لگی۔

"تو پھر کٹی۔"

"بالکل۔"

"تو مجھ سے بیاہ نہیں کرے گی؟"

"میری موت آئی ہے جو تیرے جیسے چھچھورے سے بیاہ کر کے اپنی مٹی پلید کرواؤں گی۔"

چاندنی نے ناک سکوڑی۔

"پھر کس سے بیاہ کرے گی؟"

"جس سے میرا من چاہے گا۔"

"تیرے من کی ایسی تیسی۔ میں سالے کے گولی مار دوں گا۔"

"اوہ بڑا آیا لاٹ صاحب گولی مارنے والا۔ پہلے کنڈی میں منہ دھو آ ---- بدھو۔"

"چاندنی زبان سنبھال کر بات کر ---- مجھے بدھو کہہ رہی ہے؟" چندر غرا کر اس پر چڑھ آیا۔

"ہاں ہاں بدھو' گنوار۔" چاندنی نے اسے پرے دھکیلا۔

"گنوار؟"

ہاں پلے سرے کا گنوار ----" چاندنی پلٹ کر موری پھلانگتی بھاگی۔

"پلے سرے کا گنوار؟" چندر نے اڑنگا لگایا۔

"ہائے رام۔" چاندنی موری سے بہی ہوئی کیچڑ میں رپٹی۔ وامت کچکچا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے کیچڑ سمیٹ کر چھپاک سے چندر کے منہ پر ماری اور آن کی آن میں دونوں کیچڑ میں گتھم گتھا ہو گئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" بڑے سرکار نے برآمدے کی سیڑھیوں پر سے پوچھا۔

"ملاپ!" اوشا رانی کھکھلا کر ہنسیں اور نارنگی کے رس کا گلاس بڑھا دیا۔ چندر اٹھ کر بھاگا اور چاندنی بھیگی ہوئی چوہیا کی طرح غسلخانے میں رینگ گئی۔

"اوشا رانی!"

"جی؟"

"یہ نارنگی کا گلاس تم پی لو۔ تمہیں اس کی بہت ضرورت ہے۔ دیکھو نا کتنی مرجھا گئی ہو۔"

"میں؟"

"ہاں- تم بوڑھی ہوتی جا رہی ہو- ارے بتیس برس ہی میں تمہارے بال سفید ہونے لگے؟ چہ چہ- میری جان کے پیچھے پڑی رہتی ہو' اپنی صورت آئینے میں نہیں دیکھتیں' کیسی پھٹکار برسنے لگی ہے!"

اوشا رانی کے ہاتھ سے رس بھرا گلاس چھوٹ پڑا-

"صورت بھگوان جیسی عادت شیطان جیسی!"

چاندنی بڑے سرکار کی چاندی کے فریم میں لگی ہوئی تصویر پر ریمارک پاس کر کے جی ہی جی میں خوش ہو رہی تھی' اور امنگ بڑھی تو گریبان میں سے قلم نکال کر شیطان لکھ کر سینگ بنانے میں مشغول تھی کہ ایک دم قیامت ٹوٹ پڑی-

"ہائے رام!" چاندنی پلٹی تو ماسی کا وہ زنانے دار تھپڑ پڑا کہ تارے نظر آ گئے-

"نمک حرام! کمینی! چوٹی!" تڑاتڑ تھپڑوں اور دھموکوں کا طوفان برستا رہا-

"جس تھالی میں کھانا اسی میں چھید کرنا- بدذات! چھنال کی جنی!"

چاندنی کی چیخیں سن کر سب جمع ہو گئے- وہ دوپٹے سے تصویر صاف کرنے لگی تو چاچی نے اسے ایک زور کا دھکا دیا اور تھانے دار کی طرح تصویر داب کر کھڑی ہو گئی' جیسے قتل کے ثبوت میں اسے لاش ہی تو ہاتھ آ گئی ہو-

"یہ دیکھ---- دیکھ اپنی چہیتی کے لچھن-" انہوں نے چندر کی آنکھوں میں تصویر گھسا کر کہا-

"یہ--- یہ تو نے لکھا ہے؟" چندر نے مری ہوئی آواز میں پوچھا-

"چندر جی-" چاندنی لرز کر ہکلائی-

"ہاں ہاں کہہ دے مالزادی کہ تو نے نا لکھا-" بڑے سرکار کو لائبریری سے نکلتا دیکھ کر چاندنی کو چھوڑ کر ان پر لپکیں-

"تم سے کہتی ہوں اس ابھاگن کو کسی اناتھ آشرم میں پھنکوا دو- یہ دیکھو --- دیکھو-" ماسی رو پڑیں-

"خوب!" بڑے سرکار بڑی دریا دلی سے مسکرائے- سارا گھران کی ایسی پوجا کرتا تھا کہ وہ اکتا گئے تھے- بجائے غصے کے انہیں چاندنی کی اس شرارت میں چاشنی ملی- "مگر ماسی اگر ہمارے بارے میں کوئی کچھ رائے رکھتا ہے تو اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟" وہ ہنستے ہوئے چلے گئے-

"بڑی آئی رائے کی بچی! ارے مٹی ڈالوں اس کتیا کی شکل پر--- موئی حرام

کی بچ!"

"چندر جی میں نے---- میں نے تو یونہی مذاق میں۔"

"تمہارا ان سے مذاق کا کونسا ناطہ ہے؟" چندر غرایا۔

"میں ہاتھ جوڑتی ہوں چندر جی بھول ہوئی' تمہارے پیر پڑتی ہوں۔"

"میرے ہاتھ پیر جوڑنے سے کام نہ چلے گا' جسے گالی دی ہے اسی سے معافی مانگو۔" چندر نے اسے جھٹکے سے الگ کر دیا۔

"ہائے---- نہیں----" چاندنی سہم گئی۔

"ہوں---- تو اب تو ان سے معافی بھی نہیں مانگے گی؟ قسم سے اتنے جوتے پڑیں گے کہ۔" چندر غرایا۔

"تو مار لو جوتے۔"

"دور ہو---- مجھ سے آئندہ بات کی تو اچھا نہ ہو گا۔"

"تو معافی مانگ لوں گی' چلو۔"

"میں کیوں چلوں؟" چندر کرسی پر لیٹ گیا۔

"ہائے میں اکیلی جاؤں؟" چاندنی بگڑی۔

"اکیلی کو کیا کوئی کھا جائے گا؟"

"مگر---- میں----" چاندنی کچھ نہ بول سکی' "ہمو رانی!"

'نا بھئی مجھے کاہے کو پھنساتی ہو' مجھے کلاس جانا ہے۔"

"ہے بھگوان! رام کرے میں تو مر ہی جاؤں۔ ہمو جی دروازے تک چلی چلو---- میری کیسی ہمو جی----" چاندنی اسے پھسلانے لگی۔

"چل' دروازے تک چلے چلتے ہیں پر کہے دیتے ہیں ہم اندر نہیں جائیں گے ہاں۔" ہمو راضی ہو ہی گئی۔

"مگر سوریا تجھے یہ کیا سوجھی؟ باپ رے باپ! بڑے بھیا کو شیطان کہتی ہے! وہ تو تیرا کتنا خیال کرتے ہیں۔"

"تو نہیں جانتی ہمو۔" وہ ایک دم چپ ہو گئی۔

"ارے میں سب جانتی ہوں۔ تجھے وہ غصے سے گھورتے ہیں تو تو سمجھتی ہے نفرت کرتے ہیں۔ نہیں چاندنی وہ تجھ سے نہیں چندرو سے غصہ ہیں اور فیملی پریسٹیج کا خیال ہے۔ مگر تو دیکھنا وہ راضی ہو جائیں گے۔ لے جا۔" اس نے بڑے سرکار کے دروازے پر پہنچ کر کہا۔

ہمو۔ تو بھی---"

"چل ہٹ"

"مگر سن تو۔ دیکھ کیا کر رہے ہیں؟"

"پڑھ رہے ہیں۔ کتاب۔" ہمو نے جھانک کر کہا۔

"کیا ہے؟" اندر سے بڑے سرکار بولے۔

"وہ--- چاندنی---- بڑے بھیا۔" ہمو پکڑی گئی۔

"تو پھر؟"

"معافی ما---- وہ معافی مانگنے آئی ہے۔"

"اچھا؟" بڑے سرکار دل کی دھڑکنیں سنبھالنے لگے۔ "آنے دو۔" انہوں نے پیشانی سے پسینہ پونچھ کر کہا۔

"تو بھی آ رانی۔" چاندنی اس کے گریبان میں جھول گئی۔

"پرمیلا' درگا سے کہو چائے لے آئے۔" بڑے سرکار نے حکم دیا۔ ہمو جھٹکا دے کر بھاگی۔

چاندنی ایک دم بدک کر بھاگنے لگی مگر پھر کوئی راستہ نہ پا کر مرے مرے قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ بڑے سرکار اس کی طرف پیٹھ کیے بالکل بے خبر بیٹھے تھے' وہ پھر پلٹ کر جانے لگی۔

"تو تم معافی مانگنے آئی ہو؟ وہ اس کی طرف مڑے مگر نظریں کتاب پر جمائے رکھیں۔ چاندنی کی کچھ ہمت بندی۔

"آؤ' بیٹھو۔" وہ سہمی ہوئی آئی اور ایسے پر تولتی ہوئی چڑیا کی طرح کرسی کی نگر پر ٹک گئی کہ شو کیا اور پھر سے اڑی۔

"ہوں۔ تو اپنے کون کون سے گناہوں کی معافی مانگنے آئی ہو؟" وہ بڑبڑائے۔

"جی۔" مری ہوئی آواز حلق ہی میں سسک کر رہ گئی۔

"ہاں۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری' "پچھلے جنم میں جو پاپ کیے تھے ان کی سزا مل رہی ہے؟ وہ جیسے خود سے بولے۔

"میں نے غلطی کی' معافی چاہتی ہوں۔" وہ اٹھ کر چلنے کو تیار ہو گئی۔

"مگر میں نے تو ابھی معاف نہیں کیا۔" وہ شرارت سے مسکرائے۔ "بیٹھو۔" مگر چاندنی کھڑی رہی۔

"کوئی میرے سوال کا جواب نہیں دیتا۔" وہ بڑبڑائے۔

"جی؟" چاندنی کچھ نہیں سمجھی۔ انجانا خوف اس کا گلا گھونٹنے لگا' وہ ملتجی

نگاہوں سے انہیں تکنے لگی۔
"کہ ---- کہ تم جب یوں دیکھتی ہو تو میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں آسیب سر اٹھانے لگے۔
چاندنی نے نادم ہو کر جھٹ سے پلکیں جھکا لیں' بڑے سرکار ہنس پڑے۔
"یہ اور بھی زیادتی ہوئی۔ وہ خود سے بولے۔
"میں جاؤں؟"
"مگر میرے سوالوں کا جواب تو دیتی جاؤ۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
"میں؟"
"ہاں تم ---- تم میرا تماشہ بنانا چاہتی ہو؟" ایک دم ان پر خون سوار ہو گیا۔
چاندنی نے جٹ پلکیں جھکا لیں۔
"یہ اور بھی ظلم ہوا۔" بڑے سرکار نے فریاد کی۔
"میں ---- میں جاؤں؟"
"میرے سوالوں کا جواب دیتی جاؤ۔ مجھے کیا ہو گیا ہے؟" انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا' "میں پاگل ہو جاؤں گا۔"
چاندنی ایک دم اٹھ کر بھاگی۔
"ٹھہرو ---- " انہوں نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا۔ ہاتھ لگنا تھا کہ قیامت ٹوٹ پڑی' فضا میں بارود پھٹ پڑی' ایک خاموش دھماکہ ہوا اور بڑے سرکار کا جسم لرزنے لگا' گردن کی رگیں کھڑی ہو گیس' پسینے کے فوارے پھوٹ نکلے۔ بڑی لجاجت سے انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے دل پر رکھا۔ معلوم ہوتا تھا اندر کوئی زخمی درندہ اچھل رہا تھا۔ پھر انہیں ہوش نہ رہا' انہوں نے وحشیوں کی طرح اس کے کپڑے تار تار کر ڈالے۔ چاندنی کے منہ سے ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی اور ہونٹوں پہ ان گنت سانپ ڈسنے لگے۔
ایک پرشور جھناکا ہوا اور آرتی کی تھالی چیختی چنگھاڑتی فضا کے کان گنگ کر گئی۔
"کلنکنی! ڈائن تیرا ستیا ناس ہو۔" ماسی دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا نوچنے لگیں جیسے پھانس چھڑا رہی ہوں۔ ایک دم وہ لڑکھڑا کر کرسی سے ٹکرائیں۔ خون کے دباؤ سے ان کا منہ نیلا پڑ گیا' جیسے کالی ناگن نے ڈس لیا ہو۔ تیورا کر وہ فرش پر ڈھیر ہو گئیں۔

تھالی کی آواز اور چاندنی کی چیخ سن کر سارا گھر دوڑ پڑا۔
"ڈاکٹر' بھگوان کے لیے ڈاکٹر ---- " اوشا ماں کا سر زانوں پر رکھ کر بلکنے لگی۔
ہمو نے جلدی سے دیوار سے چپکی ہوئی چاندنی کی درگت سے سہم کر اس پر پلنگ سے چادر گھسیٹ کر ڈال دی اور وہ گرتی پڑتی بھاگی۔
"منشی جی ڈاکٹر کو فون کیجیے' فالج معلوم پڑتا ہے۔"
چندر ماسی کے منہ پر پانی چھڑکنے لگا۔
"نہیں!" وہ بڑی زور سے چیخے مگر سب کو حیرت سے تکتا دیکھ کر سنبھل گئے'
"میں فون کرتا ہوں۔"
نمبر ملاتے وقت وہ سوچنے لگے اگر ماسی بچ گئی تو؟ تو سارا ملمع اتر جائے گا۔ وہ یہ ذلت نہ سہہ سکیں گے۔
"ہوں۔ ڈاکٹر نے فون پر جواب دیا۔ ہلو!"
مگر انہوں نے مجرموں کی چاروں طرف دیکھا اور فون رکھ دیا۔
ماسی دل کی پرانی مریضہ تھیں۔ بڑے سرکار نے بیکار جھوٹ بول کر اپنے ضمیر پر پتھر لاد لیے۔ اگر ڈاکٹر کو اطلاع بھی ہو جاتی تو وہ اس کے آنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتیں۔
چاچی نے دم توڑنے سے پہلے بہت کچھ کہنا چاہا مگر زبان نہ کوئی۔ انہوں نے اوشا کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھمانا چاہا مگر وہ انجان بنے رہے۔ ماسی کے سرہانے بیٹھے سر پکڑے روتے رہے۔ کون جانے وہ ماسی کو رو رہے تھے یا اور موت کا ماتم کر رہے تھے' جو ان کے وجود میں آہستہ آہستہ رینگتی چلی آ رہی تھی! سب یہی سمجھے کہ ماسی نے غصے میں چاندنی کو مارا اس وجہ سے شاید دماغ کی کوئی رگ پھٹ گئی۔
بڑے سرکار نے اس کی تردید کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور چاندنی کی زبان نہ کھل سکی۔
ماسی کی موت کے بعد کئی مہینے تک خاموشی چھائی رہی۔ بڑے سرکار بالکل ہی گوشہ نشین ہو گئے۔ اپنے کمرے میں اکیلے اپنے خیالوں کی دنیا میں کھو کر وہ اور بھی الجھ گئے۔ چاندنی بھی یہی کوشش کرتی کہ اس پر ان کی نظر ہی نہ پڑے۔
اوشا رانی پر سارے گھر کی ذمہ داری آن پڑی۔ اب تو وہ بالکل گھر والی معلوم ہونے لگیں۔ بالکل پرانی بیاہی بیوی کی طرح جسے شوہر گھر کے ساز و سامان کی طرح

رکھ کر بھول گیا ہو۔

موسم میں کچھ بکلی کے جراثیم آ گئے تھے، ٹیسو کا جنگل دہک اٹھا تھا، بڑے سرکار کچھ بے چین سے رہنے لگے تھے مگر فضا ابھی چپ چاپ تھی۔

چاندنی بے خبری میں تیتری کی طرح ناچتی زینے پر سے اتر چلی آ رہی تھی۔ آج بڑے سرکار اکتا کر باہر نکل پڑے تھے اور پیانو کے پاس بیٹھے یونہی اکا دکا سر چھیڑ رہے تھے، اسے دیکھ کر مہینوں کی دبی ہوئی چنگاری کو پھر ہوا لگی اور ان کی انگلیاں پیانو کے پردوں پر بہکنے لگیں۔ چاندنی بوکھلا کر بھاگنے کو مڑی۔

"سنو!" سانپ کی پھنکار کی طرح ان کی آواز سرسرائی۔ چاندنی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔

"ادھر آؤ۔" ان کی آنکھوں میں سے جیسے دو کالے ناگ نکل کر اس کے جسم کے گرد لپٹ گئے۔ ایک انجانی طاقت سے کھنچتی ہوئی وہ ان کی طرف بڑھنے لگی۔ ہوا سکتے میں رہ گئی، فضا نے سانس روک لیا۔ بڑے سرکار کی نگاہیں لوہے کی گرم گرم سلاخوں کی طرح اس کے آر پار نکل گئیں۔

آہستہ سے انہوں نے اس کی مختصر سی کمر کو اپنے ہاتھوں کے حلقے میں جکڑ لیا۔ ہاتھ ہولے ہولے اوپر سرکنے لگے۔ اوپر۔ اور اوپر۔ مفلوج پرندے کی طرح وہ ڈھیلے ہاتھ چھوڑے لرزتی رہی۔ ایک ہلکے سے اشارے پر وہ ان کے سینے سے لگ گئی۔

دھڑ دھڑ کرتا چندر طوفان میل کی رفتار سے سیڑھیوں پر سے اترا۔ ایک دم فضا چیخ کر جاگ اٹھی، چاندنی بڑے سرکار کے ہاتھوں سے نکل کر چندر سے لپٹ گئی۔

"چندر جی۔ چندر۔"

بڑے سرکار نے اپنے خالی ہاتھ پیانو کے سروں پر دے مارے اور ان پر اپنا سر ڈال دیا۔ یوں بڑے بھائی کے سامنے چاندنی کا لپٹنا اسے بڑا ناگوار گذرا۔

"ارے ارے۔ بڑے بھیا بیٹھے ہیں پگلی۔"

چاندنی گھبرا کر دور ہٹ گئی اور مرے مرے قدموں سے اوپر چل دی۔

"کیا ہوا بڑے بھیا۔" وہ انہیں سرنگوں دیکھ کر گھبرا گیا۔ "کیا سر میں درد ہے؟"

"آئیں۔۔۔ ہاں۔۔۔۔"

"افوہ! آپ دن بھر پڑھا کرتے ہیں۔ میں ابھی ٹھیک کیے دیتا ہوں۔"

"چاندنی۔" اس نے زینے کے پاس جا کر پکارا۔

چاندنی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا ہے چندر جی۔"

"ذرا دیدی کے کمرے سے بادام کے تیل کی شیشی تو لے آؤ۔" اس نے ہانک لگائی "بڑے بھیا آپ ذرا آرام سے کرسی پر لیٹ جائیے۔" اس نے انہیں لٹا کر جوتوں کے بند کھولنے شروع کیے۔

چاندنی تیل لے کر آئی تو اس نے کہا۔

"ذرا بھیا کے سر میں تیل ڈالو۔" وہ ان کے پیر دبانے لگا۔

"میں؟ چندر جی؟"

"ہاں۔"

"میں۔۔۔ مجھے کام ہے۔ تم۔۔۔۔ تم ڈال دو نا۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"ارے میں ٹینس کی پریکٹس کے لئے جا رہا ہوں۔ ہاتھ چکنے ہو گئے تو ریکٹ پھسل جائے گا۔"

"دھو لینا ہاتھ۔"

"بکو مت۔ تم ڈال دو گی تو کون سا تمہارا دم نکل جائے گا۔"

جتنا اکیلے میں چاندنی سے دبتا تھا اتنا ہی سب کے سامنے دکھانے کے لیے اس پر رعب جماتا تھا۔

"رہنے دو چندر، آپ ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" بڑے سرکار بڑی معصومیت سے کراہے۔

"ارے واہ، بھلا آپ ہی کیسے ٹھیک ہو جائے گا؟ چاندنی!"

چاندنی اس کی آواز کے روکھے پن سے سہم کر تیل ڈالنے لگی، بڑے سرکار اس کی گھبراہٹ کا مزہ لینے لگے۔

چندر آج کا اخبار کہاں ہے؟ انہوں نے اخبار پہلو میں دبا کر پوچھا۔ چاندنی کے پسینے چھوٹنے لگے۔

آپ کے کمرے میں ہو گا۔"

"نہیں، وہاں تو نہیں ہے۔"

"تو شاید برآمدے میں رکھا ہوگا، لاؤں"

"پلیز۔"

"اور وہ ریکٹ کی بلتی چھڑانا ہے۔" چندر نے دبی زبان سے کہا۔

"بٹوہ سرہانے ہو گا۔"

"ابھی لایا۔" چندر سیڑھیوں پر لپکا۔

"چندر جی۔" چاندنی کی مری ہوئی آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔

"بڑے سرکار کے چہرے پر خبیث مسکراہٹ لرزنے لگی' نتھنے پھیل گئے' گردن کی رگیں پھڑپھڑانے لگیں۔ کنپٹی کھجانے کے بہانے انہوں نے چاندنی کی انگلیاں چھو لیں۔ لرز کر چاندنی نے ہاتھ کو سمیٹ لیا۔

اس کی نظریں زینے پر لگی تھیں کہ کب گدھا چندر اخبار ڈھونڈ کر لائے تو اس کی گلو خلاصی ہو۔ کاش اخبار چھپاتا دیکھ کر وہ چلانے لگتی---- مگر اس میں کہاں اتنا دم تھا؟ بڑے سرکار نہایت مکاری سے انجان بنے بار بار اس کی انگلیوں سے چھیڑ چھاڑ کئے جا رہے تھے۔

چاندنی کی دعا قبول ہو گئی۔ اوشا رانی رسوئی کی طرف سے لوٹ رہی تھیں۔ کوئی بڑے سرکار کا کام کرے۔ یہ ان کی حق تلفی تھی۔ ہولے سے آکر انہوں نے چاندنی کو ہٹا دیا اور خود سر تھپکنے لگیں۔ ایک دم بڑے سرکار نے حیرت سے آنکھیں کھول دیں' ان کے دل میں خوشی سے مور ناچنے لگے' انہوں نے پھر بڑی ہوشیاری سے ہاتھ چھونے کی کوشش کی۔ جب کوشش الٹی ادھر سے بھی ہونے لگی تو ان پر نشہ طاری ہو گیا۔ اوشا کھل کر پھول کی طرح مہک اٹھیں۔ مزاحمت نہ پا کر ہولے سے انہوں نے ان کی انگلیوں میں اپنی کانپتی ہوئی انگلیاں سونپ دیں۔ بڑے سرکار نے ناخنوں ان کی ہتھیلی میں آہستہ سے سے گاڑ دیا۔ مسرت سے جھوم کر اوشا نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہمت اور بڑھی اور بڑے سرکار نے ان کا ہاتھ کھینچ کر اپنے رخسار پر رکھ لیا۔ ذرا سی ٹھیس کی بات تھی' اوشا رانی پکے پھل کی طرح بڑے سرکار کی گود میں آ رہیں۔

بڑے سرکار پر جیسے آسمان پھٹ پڑا۔ وہ انہیں دور جھٹک کر ایک دم کھڑے ہو گئے' جیسے کسی نے ان پر بھر ٹوکری سانپ لوٹ دیئے ہوں۔ اوشا رانی بے سہارا ہو کر دھڑام سے پکے فرش پر گریں۔ اچانک یوں رنگ میں بھنگ کی وجہ تھوڑی دیر ان کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بڑے سرکار کی شعلہ بار آنکھوں کا جلال دیکھ کر کانپ اٹھیں۔

"ہوں' سمجھی!" انہوں نے فوراً ہی معاملے کی تہ کو پہنچ کر سر ہلا دیا۔

"کیا سمجھیں؟ تم کچھ نہیں سمجھیں۔ سمجھنے کی طاقت ہوتی تو۔"

"تو؟"

"تو---- تو یہ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی کہ---- کہ---- افوہ---"

اوشا کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو ڈھلکتے دیکھ کر وہ پست ہو گئے۔

"میرا کوئی کام آپ کو پسند نہیں؟"

"مگر تم آخر میرے ہی پیچھے کیوں پڑی ہو' گھر کا اور کوئی کام کیوں نہیں کرتیں؟"

"میرا ہاتھ لگانا آپ کا اتنا ناگوار گزرا؟ اور وہ---- وہ----"

"کون؟" بڑے سرکار گرجے۔

"آپ جانتے ہیں کون۔ آپ نے اس کا ہاتھ سمجھ کر پکڑا تھا۔"

اوشا رانی اتنی ہتک نہ سہار سکیں اور سسکنے لگیں۔

"بند کرو بکواس! بیوقوف---- کیا---- کیا تم مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو؟---- تم!" انہوں نے اوشا کو کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ وہ بری طرح روتی ہوئی ان کے چرنوں پر گر گئیں:

"بھگوان کے لئے ایسا نہ کیجئے۔ میں مر جاؤں گی' مجھے یوں نہ ٹھکرایئے۔

"اوشا رانی' یوں عورت جاتی کی ہتک کرنے سے تو اچھا ہے تم مر ہی جاؤ۔ بھگوان کے لئے مجھے مجبور نہ کرو۔"

اوشا رانی کی حمیت نے ذرا آنکھ کھول کر انگڑائی لی۔

"آپ یہ اچھا نہیں کر رہے ہیں' پچھتائیں گے۔"

"تمہاری بلا سے' تمہیں میرا اتنا درد کیوں ہے؟"

"اس لئے کہ---- کہ---- آپ تو خود جانتے ہیں یہ اپنے بس کی بات نہیں ہوا کرتی۔"

"اوہ' میرا دماغ نہ چاٹو---- جاؤ----"

"میں----"

"کہتا ہوں جاؤ!"

"اوشا سسکیاں روکتی بھاگیں ایک دم بڑے سرکار سہم گئے:

"اوشا' سنو اوشا' تمہیں ہماری سوگند۔"

اوشا زخمی ہرنی کی طرح ٹھٹک گئیں۔

"بھئی بڑی بیوقوف ہو---- مذاق میں ہی رو پڑیں!" انہوں نے آہستہ سے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا۔ اوشا احمقوں کی طرح تکنے لگی۔

"چندر نے زبردستی کہا تیل ڈال دو' میں انکار نہ کر سکا۔ پھر تم آ گئیں تو مجھے فوراً پتہ چل گیا۔ مگر یونہیں نہ جانے کیا دل میں سمائی کہ تمہیں ستانے کے لئے---- ذرا مذاق میں کھینچا' تم گر پڑیں تو میں گھبرا گیا---- تم ہی سوچو---- میں سمجھا تھا تم ہاتھ چھڑا لو گی۔"

"اوہ----" اوشا اتنا ہی سارا قصور جان کر شرم سے سرخ ہو گئیں۔

"اگر تمہیں ناگوار گزرا تو معاف کر دو' غلطی ہوئی۔"

"مگر---- مگر آپ کو پسند نہیں کہ میں آپ کا کوئی کام کر دوں؟"

"بالکل پسند نہیں اور جب تمہیں کام کرتے دیکھتا ہوں تو خون کھول جاتا ہے۔ اتنے نوکر کس لئے ہیں؟ بس تم ضد کرتی ہو تو الٹی سیدھی باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں' بعد میں افسوس ہوتا ہے۔ معاف کر سکو گی؟"

"کوئی بات نہیں۔" اوشا اور شرمائی۔

"ارے تمہاری کہنی چھل گئی۔ بھئی میں بڑا ذلیل ہوں۔"

"نہیں---- نہیں ایسی کچھ زیادہ چوٹ نہیں لگی۔"

اوشا بیچاری نے عاشقوں کی اور کوئی طور طریقے تو نہ دیکھے تھے' دل میں سمجھیں یہی طریقہ ہوا کرتا ہو گا۔ عاشقوں کا۔ مسکراتی رہیں۔ اتنے میں چندر آ گیا۔

"کہیں نہیں ملا اخبار۔ ارے یہ تو یہاں پڑا ہے۔" بڑے سرکار ہڑبڑا کر اٹھے تو پہلو سے اخبار ٹپک گیا تھا۔ "تم ایسے طوفان کی طرح گرجتے برستے زینے پر چڑھتے ہو کہ پکارا بھی پر تم نے نہ سنا۔"

چندر کھسیا کر جانے لگا۔

"ارے چندر ادھر آؤ' اخبار اٹھاتے لاؤ۔ پھر انہوں نے بیٹھ کر چندر سے اسپورٹ کالم پر مباحثہ شروع کر دیا۔

اوشا چندر کی جان کو کوستی ٹھنڈی سانس بھر کے چلی گئیں۔ ایک ذرا سا موقعہ ملا تھا' اچھا خاصہ امید افزا لو سین چل رہا تھا کہ منحوس ٹپک پڑا۔ معاملہ چوپٹ ہو گیا۔ خیر آج رات جب خوابوں کا تانا بانا بنا جائے گا۔ تو وہ ان کے ہاتھ کا لمس' وہ ان کی آغوش کا ایک لمحہ' وہ ٹھوڑی پر انگلیوں کا چھونا---- سب ہی تو اجاگر ہو کر دل کے سونے پن کا سہارا بن جائے گا۔

پے در پے ناکامیوں سے بجائے چاندنی کا سودا کم ہونے کے اور عجیب عجیب شکلیں اختیار کرنے لگا۔ اگر بڑے سرکار معمولی انسان ہوتے تو شاید حالات اتنی نازک صورت نہ اختیار کرتے' انہیں اوشا سے پیار ہو جاتا یا عورت ذات سے نفرت ہو جاتی اور سدا کنوارے رہنے کی قسم کھا لیتے۔ مگر وہ آہستہ آہستہ قوت ارادی کھوتے جا رہے تھے ان کی وحشتیں اور بڑھ رہی تھیں: رات رات بھر سردی میں ننگے پیر کھلی چھت پر ٹہلا کرتے۔ اگر رات گئے آنکھ لگ بھی جاتی تو ان کے دماغ میں جو بھوت پریت قید تھے آزاد ہو کر اودھم مچانے لگتے اور تب ان کا بس نہ چلتا اور ان کا شعور من مانی کرنے پر تل جاتا۔ کبھی چونک کر جاگ پڑتے تو انہیں معلوم ہوتا نہ جانے رات کو کس وقت وہ نیند میں چل کر چاندنی کے دروازے تک پہنچ گئے ہیں' اس کی دہلیز پر سر ٹکرائے آنسو بہا رہے ہیں۔ جب ہوش ٹھکانے ہو جاتے تو شرم اور ذلت سے مضمحل ہو کر وہ بھاگ کھڑے ہوتے۔ رات کے سناٹے میں وہ دور دور جنگل میں بھٹکتے چلے جاتے۔ تب تو انہیں نیند سے بھی ڈر لگنے لگا کیونکہ وہ اسی طرح بجائے دروازے کے تاریک راستوں سے گزرتے ہوئے اس برج پر پہنچ گئے جہاں سے چاندنی کے کمرے کی کھڑکی تک پہنچنے کے لئے ایک نہایت خطرناک پتلی سی منڈیر پر چل کر جانا پڑتا تھا اپنے ہوش و حواس میں ہوتے تو ان کی کبھی ہمت نہ پڑتی کیونکہ منڈیر اتنی بوسیدہ اور پتلی تھی کہ کوئی بندر یا بلی ہی چل سکتی تھی۔ اس پر نیند میں۔ جب پانچوں حواس سو رہے تھے---- چاندنی کی لگن ایک چھٹی حس بن کر انہیں گھسیٹتی لئے جا رہی تھی۔ ساری کمزوری اور خوف اس چھٹی حس کا تابع ہو کر سو رہا تھا' صرف ایک انجانی آہنی طاقت جاگ رہی تھی۔ ایک دل دوز چیخ سناٹے کو توڑتی ہوئی دور پہاڑیوں پر سر پٹخ کر واپس پلٹی' آسمان سے ایک تارا ٹوٹا اور لمبے شگاف کے سرے پر دم توڑ کر ڈوب گیا' بڑے سرکار ایک خاموش دھماکے سے جاگ پڑے۔ انہوں نے دیکھا وہ کھڑکی تک پہنچ چکے ہیں۔ شیشہ ننگے ہاتھ سے توڑنے کی وجہ سے بری طرح خون میں تر ہو رہا ہے۔ ایک دم چھٹی حس جو سوتے میں انہیں بہکا لاتی تھی اب تنہا چھوڑ کر غائب ہو گئی۔ ان کی نظر نیچے کھاڑی کی طرف گئی تو ساری کائنات ہنڈولے کی طرح چکر کھانے لگی۔ سب کو جان پیاری ہوتی ہے اور اس وقت بڑے سرکار دیوتا نہیں ایک معمولی سے سہمے ہوئے انسان تھے۔ دیوار سے چپک کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

چاندنی کی مسلسل چیخوں سے گھر میں جگار ہو گئی۔

"وہ---- وہ----" چاندنی دیوانوں کی طرح کھڑکی کی طرف اشارہ کر رہی تھی' "بڑے سرکار---- بڑے سرکار----" اور وہ وہیں چندر کی بانہوں میں ڈھیر ہو گئی۔ اسے ہمو کے ہاتھوں میں سنبھال کر جب چندر کھڑکی پر آیا تو اوشا دیدی وہاں پہلے ہی پہنچ چکی تھیں۔

"کون تھا۔" چندر کھڑکی کھولنے لگا۔

"نہیں---- کوئی نہیں تھا۔" اوشا کی چیخ نکل گئی۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کے پٹ تھام لئے۔

"مجھے دیکھنے تو دیجئے۔ اگر کوئی تھا تو اتنی جلدی بھاگ نہیں سکتا۔"

"نہیں۔" انہوں نے چندر کو دھکا دیا۔ وہ جانتی تھیں کہ اگر بڑے سرکار کا پول کھل گیا تو وہ زندہ نہ رہ سکیں گے۔ پٹ بند کرنے سے پہلے اس نے ان کا خون میں نہایا ہوا ہاتھ اور ان کی انگوٹھی دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ انہیں بہت دن سے شبہ ہو رہا تھا۔ محبوب اپنے دیوانے سے دل کا حال کب تک چھپا سکتا ہے! مگر وہ ان کی محبوبہ نہیں پجارن تھیں۔

"نہیں چندر و چور ہو گا تو تیری گردن کاٹ لے گا۔" ہمو چلائی۔

"اگر ان کا پیر پھسل گیا تب بھی موت واقع ہو گی۔ اوشا نے دانت بھینچ کر سوچا' مگر بڑے سرکار کے ناموس پر دھبہ تو نہ لگے گا۔ آنے والے حادثے کے خوف سے وہ سر سے پیر تک کانپ رہی تھیں۔ سناٹے پر کان لگائے کھڑی تھیں کہ بڑے سرکار آہستہ آہستہ سرک رہے تھے۔ ایک پتھر ٹھوکر کھا کر گرا اور دور تک وادی میں سر ٹکراتا چلا گیا۔ اوشا نے ایک گھٹی ہوئی سسکی بھری۔

"باہر کوئی ہے' مجھے دیکھنے تو دیجئے۔" چندر نے انہیں ہٹانا چاہا مگر وہ اعصاب کے تناؤ سے بپھر کر ایسی بری طرح چیخیں کہ وہ گھبرا گیا۔

"چندر و بھیا کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑا ہے۔" ہمو نے اپنے بھولپن سے موقعے کی نزاکت کو سنبھال لیا۔ "اوشا دیدی اسے مت جھانکنے دیجئے گا۔"

"تم لوگ اپنے اپنے کمرے میں جاؤ۔ ہمو جی چاندنی کو میرے کمرے میں لے جاؤ۔"

"میں بھی وہیں سو جاؤں؟"

"ہاں۔ میں یہاں سو جاؤں گی۔"

"نہیں اوشا دیدی' چور پھر آیا تو۔"

"نہیں بی بی چور اب نہیں آئے گا۔" وشا نے مہین مری ہوئی آواز میں کہا۔

"چاندنی تو نے اپنی آنکھوں سے چور کو دیکھا۔" ہمو نے پوچھا۔

"چور نہیں---- وہ------" چاندنی ایک دم چپ ہو گئی۔

"چور نہیں تو پھر کون تھا؟"

"کوئی نہیں۔" چاندنی چڑ گئی۔

"تو پھر کیوں چیخی؟"

"سپنے میں ڈر گئی تھی۔"

"مگر---- شیشہ کس نے توڑا؟"

"میری جان نہ کھاؤ ہمو۔" چاندنی رو پڑی۔

"ارے واہ' ہم تو پوچھ رہے ہیں۔" ہمو اداس ہو گئی۔

"نہ پوچھ' بس سو جا ہمو رانی۔" چاندنی نے پیار سے کہا۔

"چاندنی؟" ہمو نے سونے سے پہلے پوچھا۔

"ہوں؟"

"تو نے بڑے بھیا کو پکارا تھا۔"

"میں نے' نہیں تو"

"ہاں جب میں جاگی تو تو بڑے سرکار' بڑے سرکار چلا رہی تھی۔" ہمو نے اس کی نقل کی۔

"اچھا؟ مجھے یاد نہیں۔"

"مگر شاید بڑی گہری نیند سو رہے ہیں' وہ تو اٹھے بھی نہیں۔"

"ہوں۔ چاندنی نے دوپٹے سے منہ ڈھانک لیا۔ وہ کیسے بتائے ہمو کو؟ مگر اس سے بہتر موقع پھر نہ ملے گا' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی:

"ہمو۔"

"ہاں۔"

"تجھے میری بات کا وشواش ہو گا؟"

"ہاں کیوں نہیں۔"

"اگر میں چندر جی کی قسم کھا کر کہوں تب یقین کرے گی۔"

"ہاں کیا بات ہے؟"

"وہ شیشہ۔" مگر اس لئے زیادہ وہ نہ کہہ سکی۔ دروازے پر اوشا کھڑی تھیں' موم بتی کی روشنی میں اس نے دیکھا۔ انکی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں۔

"تو کیا کہہ رہی تھی۔" ہمو نے اوشا کو نہیں دیکھا تھا۔

"اگر تمہیں رات کے دو بجے بکواس کرنی ہے تو نکلو یہاں سے" انہوں نے ڈانٹا۔

"مگر اوشا دیدی چاندنی کے کمرے میں تو۔۔۔۔"

"ہاں وہیں جاؤ تم دونوں۔ چور تمہارا گلا دبا دے تب مزہ آئے۔ بھلا رات کے وقت چاندنی نے کیا دیکھا ہو گا کہ کون تھا! اور ہو گا کون! یہ نیچے کھاڑی میں چور اٹھائی گیرے بھرے پڑے ہیں۔"

"مگر کوئی چڑھا کیسے ہو گا؟" ہمو نے جرح کی۔

"مجھے کیا معلوم کیسے چڑھے ہو گا۔ میں کوئی چور ہوں! صبح پتہ چل جائے گا سب۔ اب چپ چاپ سو جاؤ۔"

انہوں نے الماری میں سے فرسٹ ایڈ کا بکس نکالا اور باہر سے دروازہ بند کر کے چلی گئیں کہ کہیں ہمو ان کے پیچھے ٹوہ لینے نہ آئے۔

"کس کے لگی چوٹ۔" ہمو نے پوچھا۔

"شی۔" چاندنی نے کروٹ لے لی۔

"اوشا دیدی تو چور کی جیسے گی ہیں۔ ایسی حمایت کر رہی ہیں کہ بات ہی نہیں کرنے دیتیں۔"

"سو جا رانی۔" چاندنی نے خوشامد کی۔

"میں بتاؤں!" ہمو نے اچھل کر کہا۔

"کیا؟"

"کوئی اوشا دیدی کا چہیتا ہو گا' اسے عشق لڑانے آیا ہو گا' بھولے سے ادھر آ گیا۔"

پریشانی کے باوجود چاندنی ہنس پڑی۔ "چل پگلی۔"

"سچی یہی معاملہ ہو گا' جب ہی تو اس کی بچ کئے جا رہی ہیں۔ خود تو گردن نکال کر جھانک لیا' چندرو بھیا کو ڈانٹنے لگیں۔ وہ دیکھ لیتے تو پکڑا جاتا نہ ان کا چہیتا۔"

"ہمو اگر تو بکواس بند نہیں کرے گی تو میں سر پیٹ لوں گی۔" چاندنی نے ڈانٹا اور ہمو چپ ہو گئی۔

ہمو تو سو گئی مگر چاندنی آنکھیں پھاڑے چھت کو گھورتی رہی۔ آنکھیں بند کرتے ڈر لگتا تھا۔ بار بار اس کی نظریں دھندلی دھندلی پر اسرار کھڑکیوں کی طرف جا رہی تھیں' جیسے ہر کھڑکی کے ساتھ کوئی اجنبی لگا کھڑا تھا۔ ادھر اس کی آنکھ لگی ادھر وہ آیا جھپٹ کر اس کی چھاتی پر اپنی بے بسی پر اسے رونا آ رہا تھا اور غصہ بھی۔ ہائے وہ کمبخت کیوں پیدا ہوئی تھی؟ وہ نہ ہوتی تو کون سی دنیا سنسان رہ جاتی۔

فرسٹ ایڈ کا بکس لئے پہلے اوشا بھاگتی ہوئی چاندنی کے کمرے میں پہنچیں۔ دھڑکتے دل سے انہوں نے کھڑکی کھول کر ٹارچ ڈالی' وہاں کوئی نہ تھا۔ نہیں' وہ نیچے نہیں گرے ورنہ آواز سنائی دیتی۔ دوسرے ٹارچ کی روشنی میں انہوں نے دیکھا دیوار پر جہاں سہارا لیا تھا خون کے دھبے تھے۔ کنگر پر بھی خون کی بوندیں تھیں۔ انہوں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ وہ برج تک صحیح سلامت پہنچ گئے۔

تیز قدموں سے وہ ان کے کمرے کی طرف جھپٹیں۔ اندر داخل ہوئیں تو وہ الماری کی دراز میں کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ آہٹ سن کر وہ پلٹے تو ان کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اوشا نے جیسے کچھ نہیں دیکھا' آہستہ سے بکس میز پر رکھ دیا' اسٹول پر بیٹھ کر بڑے اطمینان سے اسپرٹ' روئی اور پٹی نکالی۔

"قینچی کہاں ہے؟" اوشا نے میز کی دراز کھینچ کر قینچی نکالی۔

"ادھر بیڈ ہی پر بیٹھ جائیے۔" بڑی لاپرواہی سے کہا۔

بڑے سرکار کی آنکھوں میں خون اتر کر جم گیا تھا' گال اندر کو اور دھنس گئے تھے جیسے وہ برسوں کے بیمار ہوں' برج پر کانٹوں دار جھاڑیاں تھیں جن کی وجہ کپڑے تار تار ہو گئے تھے۔ یونہیں پستول لئے وہ اوشا کے سامنے رک گئے اور پاگلوں کی طرح اسے گھورنے لگے پستول کی نالی اپنی کنپٹی سے اتنے قریب دیکھ کر وہ نہ لرزی نہ کانپی' نہ موت ڈری جیسے موت کی کڑواہٹ بھی زندگی کی تلخیوں کے مقابلے پھیکی پڑ چکی ہو۔ اسپرٹ میں روئی بھگو کر وہ ان کی طرف مڑی۔ آنکھیں چار ہوئیں اور چند لمحوں کے لئے پینچ لڑتے رہے۔ بڑے سرکار کی آنکھوں میں نفرت کا زہر تھا' حقارت اور نامرادی تھی' اوشا کی آنکھوں میں اتھاہ محبت کی مٹھاس تھی' نرمی اور پیار تھا۔

بڑے سرکار کی نظریں جھک گئیں! ان کے ہاتھ سے پستول چھوٹ پڑا اور دوسرے لمحے وہ اس کی گود میں سر ڈال کر ننھے بچے کی طرح سسکنے لگے:

"اوشا رانی ہمیں ---- ہمیں بچالو۔ اوشا ہم سے شادی کر لو' ابھی' اسی وقت -- اوشا ---- ورنہ ---- ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا' میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ اوشا مجھے بچاؤ۔" ؟

اوشا ایک بار تلملا کر رہ گئی' جیسے کسی نے دستے تک چاقو اس کے کلیجے میں اتار دیا ہو۔ اس نے چاہا آج پوچھ ہی ڈالے۔

"کیا واقعی آپ مجھ سے اتنی نفرت کرتے ہیں؟ کیا آپ سے محبت کر کے میں نے اتنا پاپ کیا ہے کہ اس کی اور کسی طرح پرائشچت نہیں ہو سکتی؟ مگر اس وقت تو میرے دل میں نہ محبت ہے نہ آپ کے لئے نفرت' ایک خلا ہے! شاید ساری عمر آپ کا نمک کھایا ہے' وہی رگ رگ میں بس چکا ہے۔"

مگر اس نے کچھ بھی تو نہ کہا۔ صرف ایک بار تھکی تھکی بیزار آنکھوں سے نظر بھر دیکھا اور ایک زہریلی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ چپ چاپ سر جھکائے وہ پٹی باندھتی رہی' پھر فرسٹ ایڈ کا بکس بڑی نفاست سے سمیٹا اور دروازہ بھیڑ کر چلی آئی۔

وہ رات اوشا نے برآمدے میں ٹہل ٹہل کر گزاری۔ کتنی تنہائی ہے۔ اس کے نصیب کی! دنیا کتنی اکیلی ہے! ماسی کی موت کے بعد سے تو وہ بالکل بنا گائے کے بچھڑے کی طرح گھوم رہی تھیں۔ بڑے سرکار پر کسی قسم کا الزام رکھنا انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ ماسی کے حکم کے مطابق وہ انہیں ہر الزام سے بری سمجھتی تھیں۔

"قدرت ان کا امتحان لے رہی ہے۔ دیوتاؤں کو ان سے بیر ہو گیا ہے کیونکہ وہ دیوتاؤں سے بھی اونچے ہیں' عام دھرتی پر رینگنے والے کیڑوں سے بلند و برتر ہیں۔ اس لئے چاندنی کو آسمان سے انہیں نشٹ کرنے کے لئے اپسرا کے روپ میں اتارا ہے ورنہ وہ اتنے نیچ نہیں جو ایک بچی پر بری نظر ڈالتے۔ ساری شیطانی طاقتیں ایک گمنام لڑکی کا روپ دھار کر انہیں ورغلا رہی تھیں۔ وہی تھے جو یوں چپ چاپ جنم کا عذاب بھوگ رہے تھے۔ کوئی اور ان کی جگہ ہوتا تو اپنی واسنا پوری کر کے تباہ کرنے والی کو ہی تباہ کر دیتا۔ آسمان پر جگ مگانے والے سوریہ دیوتا کی بڑائی یہی ہے کہ وہ خاک کے ذروں کو تمازت بخشتا ہے' دھول کو اٹھا کر سر پر نہیں چڑھا لیتا۔ جبھی تو وہ اپنی ہستی کی بازی لگائے قسمت کے لکھے کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اور اوشا کی جگہ ان کے چرنوں میں ہے۔ وہ اس کے گرو دیوتا اور مالک ہیں۔ نہ جانے پچھلے جنم میں کون سے پن کئے تھے کہ ان کے پریم کا جان لیوا روگ انعام

میں ملا ہے۔ ان کی ٹھوکر ہی میں ساری عزت ہے۔ کون جانے دیوتا کا کون سا روپ اصلی ہے اور کون سا عکس بہروپ چاندنی کے لئے ان کے دل میں واسنا ہو سکتی ہے۔ مگر پریم وہ کسی سے نہیں کرتے! اگر کرتے ہیں تو وہ اسی اپنی داسی سے کرتے ہیں! اگر انہیں کوئی روگ لگ گیا ہے تو کیا یہ اس کا دھرم نہیں کہ اپنے جیون کی آہوتی دے کر انہیں بچائے؟ جب ٹہلتے ٹہلتے ٹانگیں شل ہو گئیں اور سوچتے سوچتے دماغ سن ہو گیا تو اوشا نے میرا کے بھجنوں کی کتاب اٹھا کر اپنے درد کی آواز کی گونج ان میں پائی اور اس کا جی ٹھہر گیا۔

میرے تو گردھر گوپال
دوسرا نہ کوئی۔

وہ دھیمی آواز سے پڑھتی رہی جھومتی رہی۔ سارا سنسار سو رہا تھا' ایک ناصر اور عورت اپنے سنسان دل میں غموں کا چراغ جلا رہی تھی' مگر ات اتنی ہی تاریک تھی۔

ٹھٹک کر اس نے کچھ سوچا' نہ کسی کو ساتھ لیا نہ روشنی کی فکر کی' سر پر شال اوڑھ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی سرنا دیوی کے منھ کی طرف روانہ ہو گئی' راستے کے گھنے جنگل کی سیاہی کو بھی اس نے نہیں محسوس کیا۔ کبھی ادھر باگھ بھی لگا کرتا تھا' ٹیکری پر سانپ اور بچھو کا بھی ڈر تھا مگر اوشا کے پریم کی جوت نے سارے سنسار میں چراغاں سجا دی تھی۔ اور راستہ کہکشاں کی طرح جگمگا رہا تھا۔ دور کہیں سیار ماتم کر رہے تھے' الو ان کی سنگت میں چیخ رہے تھے مگر اوشا ستی ساوتری کی طرح اپنے سہاگ کی رکشا کی دھن میں مست چلی جا رہی تھی۔

چاندنی نے ایسے چیخ ماری جیسے گیلری میں چندر نہیں کوئی بھوت مل گیا ہو۔

اوشا کے کمرے میں اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہر چہار طرف انجانا سامان نئی نئی بھیانک صورتیں اختیار کر رہا تھا۔ سب دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیں تھیں مگر بار بار ادھر ہی نظریں اٹھ جاتی تھیں۔ بہت دھیان بٹایا مگر کھڑکیوں اور دروازوں کی طرف سے اطمینان ہو جاتا تو معلوم ہوتا ہولے ہولے دیوار شق ہو رہی ہے اور کالے کالے سائے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں' کوئی دم میں اسے دبوچ لیں گے۔

نیند سے ڈر لگ رہا تھا۔ اٹھ کر اس نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور کپڑے بدل کر باہر نکلی۔ لمبا رستہ سنسان پڑا تھا۔ ڈھلتی ہوئی رات کی دھندلی نیلگوں روشنی میں سائے لپکتے ہوئے اس پر حملہ کر رہے تھے۔ تیز تیز چلتی ہوئی جونہی وہ موڑ پر پہنچی چندر سے ٹکر ہو گئی اور اس کی چیخ نکل گئی۔

"ارے واہ پگلی' اب تو مجھ سے بھی ڈرنے لگی؟" چندر ڈر کر ہنسنے لگا۔

"چندر جی---- ہائے میں مر جاؤں گی۔" وہ اس کے گریبان پر منہ رکھ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا پھاٹک کھول کر کوئی باہر گیا ہے' میں سمجھا کہ کہیں تو نہ ہو۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے چندر' اس گھر کی دیواروں سے مجھے خوف آ رہا ہے۔ مجھے زندہ نگل جائیں گی مجھے یہاں سے لے چلو نہیں تو میرا دم نکل جائے گا۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو چاندنی؟"

"اگر تم مجھے یہاں سے نہیں لے جاؤ گے تو میں خود چلی جاؤں گی۔" اس نے بھنا کر چندر کو دور دھکیل دیا۔

"مگر کوئی وجہ بھی ہو۔ تیرے ہاتھ کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔" چندر اس کے چھوٹے چھوٹے سرد ہاتھ بھاپ سے گرم کرنے لگا۔

"وجہ؟ وجہ میں یہاں نہ بتا سکوں گی۔ بس کہے دیتی ہوں تو اس وقت مجھے

یہاں سے نہیں لے گیا تو صبح میری لاش ہی ملے گی۔"

"چاندنی! ایسی باتیں نہ کر' میں تیرے ساتھ ہی مروں گا۔" چندر نے اسے لپٹا لیا۔

"مگر میں تو مرنا نہیں چاہتی۔ اسی آس پر تو جی رہی ہوں کہ ایک دن تو میری مانگ میں سیندور ڈالے گا۔ بس پھر تیرے سینے پر سر رکھ کر مر جاؤں گی۔ مجھے یہاں سے نکال لے چل مجھے مت مار چندر۔"

"کون مار رہا ہے تجھے۔ میں کل تجھے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔"

"ڈاکٹر کے پاس موت کا علاج نہیں۔"

"مگر----"

"اگر مگر نہ کرو' پچھتاؤ گے۔ تم مجھے ایک دفعہ یہاں سے دور لے چلو پھر میں سب کچھ بتا دوں گی۔ اگر میرا شبہ جھوٹا ہو تو لوٹ آنا۔"

"یہاں نہیں بتائے گی۔"

"راستے میں بتا دوں گی۔"

"صبح تو ہو لینے دے۔"

"نہیں' صبح تک شاید مجھ میں جینے کی ہمت نہ رہے۔"

"اچھا یہ چابی لے' تو کوٹ پہن کر موٹر میں بیٹھ' میں اٹھ کر یونہی چلا آیا۔"

چابی لے کر چاندنی نے کمرے میں واپس جا کر کوٹ پہنا۔ ایک نظر غافل سوئی ہمو کو دیکھا تو جی بھر آیا۔ اس کے بالوں کو آہستہ سے چوما اور نیچے اتر گئی۔ اس نے موٹر کھول کر چندر کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔

"کتنی دیر لگا دی تو نے۔" وہ آیا تو چاندنی نے پیار سے اس کے ہاتھ پر چابی مار کر کہا۔ ابھی سے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہونے لگا۔ چندر نے کچھ جواب نہ دیا' تیزی سے موٹر سٹارٹ کر دی۔ موڑ پر سیاہ کپڑے پہنے کوئی راہ گیر ایک دم سامنے آ گیا۔ مگر چندر نے موٹر کی رفتار کم کرنے کے بجائے اور بڑھا دی۔ چاندنی چیخ مار کر اسے جھنجھوڑنے لگی اور راہ گیر بال بال بچا۔

"تجھے غصہ آ رہا ہے چندر جی۔" چاندنی اس کے بازو سے لگ کر بولی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ چندر بڑا گمبھیر بنا سر جھکائے سڑک کو گھور رہا تھا۔ کالر اور ہیٹ سے اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ مگر فضا میں کچھ عجیب سی الجھن چھائی ہوئی تھی۔

"چندر جی" اس نے ڈرتے ڈرتے اس کا ہاتھ چھوا' "تم ناراض ہو۔"

"نہیں۔" چندر کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

چاندنی نے اٹک اٹک کر شروع سے لے کر آخر تک ایک ایک واقعہ بیان کر ڈالا۔ چندر بپھرا نہیں' اس سے اور اس کی ہمت بندھ گئی موٹر کی رفتار اور بڑھ گئی۔

"اپنی جان کی سوگند کھا کر کہتی ہوں۔ چندر ماسی نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا' جب ہی تو مارے غصے کے ان کے دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ اگر وہ جیتی رہتی تو سارا بھید کھل جاتا۔ اوشا دیدی بھی سب کچھ جانتی ہیں۔ صرف تم اور ہم ایسے بدھو ہو کہ کچھ نہیں سمجھتے۔ سب سے پہلے تو منشی جی نے تاڑا تھا۔ سور مجھے طعنہ دیتا تھا: میں نے خوب ہوشیاری کی' چھوٹا نکما ہے' سب کچھ بڑے کے ہاتھ میں ہے' وہی ہر چیز کا مالک ہے' ہنہ' لُچا کہیں کا۔ مجھے تو اس کی صورت سے الٹی آتی ہے۔ راکھشش کہیں کا۔ اور کیسا بھگت بنا رہتا ہے۔ میں تو مر جاؤں اس کے جنم میں بھی نہ تھوکوں میرا بدھو ہی بھلا۔"

چاندنی نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں: "مجھے نہیں چاہئے راجہ۔ میں تیری ہوں چندر اور سدا تیری رہوں گی۔ چاہے تو بیاہ کرے چاہے داسی بنا کر رکھے پر اس جنم میں تو میں تیری ہو چکی۔"

چندر کے بدن میں ایک لرزش ہوئی اور سر جھک گیا۔ بے قرار ہو کر اس نے موٹر کی رفتار اور تیز کر دی۔

ایک دم چاندنی کو ڈر لگنے لگا۔ چندر بولتا کیوں نہیں؟ بہت غصہ ہے! وہ بڑے سرکار کو دیوانہ وار چاہتا ہے۔ ان کی پوجا کرتا ہے' کہیں ان باتوں سے اس کا دماغ تو نہیں لوٹ گیا!

"چندر جی تمہیں یقین نہیں آتا؟ موٹر آہستہ چلاؤ ہماری طرف تو دیکھو چندر جی۔" اس نے چندر کا منہ اپنی طرف گھماتے ہوئے لجاجت سے کہا۔

چاندنی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں' گھگھی بندھ گئی۔ زخمی کبوتر کی طرح تڑپ کر اس نے موٹر کا دروازہ کھول کر کودنے کی کوشش کی مگر بڑے سرکار نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے زور سے بھینچ ڈالا۔

چندر جب کوٹ پہن کر مفلر کانوں میں لپیٹتا گیراج میں پہنچا تو بھونچکا رہ گیا۔ موٹر غائب تھی' دوسرے گیرج میں تالا پڑا تھا۔ وہ چکرایا ہوا باہر نکلا کہ شاید چاندنی اکیلی ہی چل پڑی۔ وہ جلدی سے چابی لینے واپس جا ہی رہا تھا کہ اوشا دیدی خاک دھول میں اٹی ہوئی گرتی پڑتی پھاٹک سے داخل ہوئیں۔

"ارے اوشا دیدی! کہاں گئی تھیں آپ؟"

"وہ------ وہ گئے!"

"کون؟"

"وہ---- بڑے سرکار چاندنی کو لے کر گئے۔"

"اوہ' تب تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ مگر------"

"گدھا کہیں کا! میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے؟ جلدی دوسری موٹر نکال۔ بھگوان جانے کیا ہونے والا ہے آج! جلدی کر چندر۔" انہوں نے اسے گیراج کی طرف گھسیٹا۔

"مگر چابی تو بڑے بھیا کے پاس ہوگی۔"

"ہے بھگوان! دوسری چابی ان کے کمرے میں ہوگی' دراز میں رہا کرتی ہے۔"

"کیا بات ہے سرکار۔" نوکر چاکر نکل کر جمع ہو گئے۔

"موٹر کی چابی۔"

"وہ تو میرے پاس ہے۔" ڈرائیور اپنی کوٹھڑی کی طرف چلا۔

"جلدی کرو۔ نہیں تم رہنے دو۔" اوشا نے چابی ڈرائیور سے لے کر چندر کو گھسیٹا' "جلدی کر چندرا۔ ہائے رام' اگر انہیں کچھ ہو گیا تو-----"

"مگر وہ اسے لے کہاں گئے ہیں؟"

"وہ---- وہ-----" اوشا سے کچھ کہتے نہ بنا۔ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔

"اوشا دیدی۔" چندر گھبرا گیا۔

"اور تیز چلاؤ چندر ----"

چلا رہا ہوں دیدی- اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

"تیز چل میرے بھیا-"

"اب اور اس سے زیادہ تیز کیسے چلا سکتا ہوں؟ چکر دار راستہ ایک طرف' کھائی دوسری طرف' چٹانیں دیکھ نہیں رہی ہیں؟" مگر اوشا دیدی یہ رات کے وقت کہاں گئے ہیں بھیا؟"

"معلوم ہو جائے گا' سب معلوم ہو جائے گا- بس تیز چلو-"

"اوشا دیدی-"

"ہاں-"

"کیا بھیا مجھ سے تو کچھ ناراض نہیں-"

"اہیں-"

"انہیں اعتراض ہے کہ میں اور چاندنی-"

"تم اور چاندنی!- ہاں ہاں وہ ناراض نہ ہوں گے تو کیا خوش ہوں گے- کم بخت بس کی گانٹھ اچھی بھلی جان کو روگ بن کر لگ گئی-"

"مگر دیدی-"

"تم ان کی جگہ ہوتے اور تمہارا چھوٹا بھائی جو جان سے بڑھ کر پیارا ہوتا' وہ ایسی نیچ حرکت کرتا تو کیا تم اس کی پیٹھ ٹھونکتے؟ اسپیڈ بڑھاؤ نا' کیا پھر پھر چل رہے ہو-" اوشا نے دیکھا چندر حماقت میں بات کو خود ہی مروڑ رہا ہے تو فوراً کترا گئیں-

"میں کوئی پاپ کر رہا ہوں؟"

"وہ تمہیں کتنا چاہتے ہیں- کیا تم پر ان کا اتنا بھی ادھیکار نہیں کہ تم غلطی کرو تو-"

"مگر وہ مجھ سے بات کرتے تو میں جواب دیتا-"

"وہ تیرے منہ کیوں لگیں؟"

دیدی اگر انہوں نے کچھ---- دیدی وہ چاندنی کے ساتھ کوئی برا سلوک تو نہیں کریں گے؟" چندر ایک دم خوفزدہ ہو گیا-

"چندر اگر اپنے بھیا اور چاندنی کی جان کی خیر چاہتا ہے تو باتوں میں وقت نہ ضائع کر- آج وہ اپنی اور اس کی جان ایک کر دیں گے- چڑیل کہیں کی' کیسا جادو کیا ہے کل موہی نے!"

"آپ کیوں اسے برا بھلا کہے جا رہی ہیں؟ قصور میرا بھی تو ہے- مجھے بھی سزا ملنی چاہئے-"

"تمہیں بھی ایسی سزا ملے گی کہ جنم جنم یاد کرو گے- تم نے گھر میں بس کا بیج بو کر آج یہ دن دکھایا ہے' تم بھی سستے نہیں چھوٹو گے' ساری عمر سر پکڑ کر روؤ گے-"

"کیا وہ اس کی جان کے درپے ہو رہے ہیں-"

"اگر اس نے آج ان کا کہنا نہ مانا تو دونوں کی جان کی خیر نہیں-"

"مگر وہ ہوتے کون ہیں- میری زندگی بنانے بگاڑنے والے! میں ان کی ہر بات مان سکتا ہوں دیدی مگر چاندنی کے معاملے میں انہیں میری بات ماننا ہی ہو گی-"

"تو کیا اس چنڈالنی کے پیچھے بھائیوں میں خون خرابہ ہو گا؟ ہائے رام چندر-"

ان کے منہ سے اصلی بات پھر بھی نہ نکلی- مگر اب چندر کو کچھ بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ سرنامیا نے آج اوشا کی سن لی تھی' اب سب ٹھیک ہو جائے گا-

دور سڑک کے موڑ پر موٹر دکھائی دی- چندر نے ایکسیلیٹر دبایا- موٹر زور سے اچھلی اور فراٹے بھرنے لگی- قریب جا کر دیکھا تو ہیڈ لائٹس جل رہی تھیں مگر موٹر خالی تھی-

ایک ہاتھ سے موڑ اور دوسرے ہاتھ سے نوچتی کاٹتی اور جنگلی بلی کی طرح بپھری ہوئی چاندنی کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ مجبوراً بڑے سرکار نے گاڑی روکی۔ جونہی رفتار کم ہوئی وہ تڑپی اور ان کے ہاتھ سے نکل کر سڑک پر جا پڑی مگر فوراً ہی اٹھ کر اندھا دھند بھاگی۔

اسے ندی کے بانسوں والے پل کی طرف بھاگتے دیکھ کر وہ بھی اس کے پیچھے جھپٹے مگر وہ کاوا کاٹ کر چٹانوں پر چڑھ گئی۔ اس کا جوتا کہیں رہا اوڑھنی کہیں۔ انہوں نے کئی بار اسے پکڑ لیا مگر وہ مچل کر چھوٹ گئی۔ اب اس کے سامنے ایک ہی صورت تھی یا تو ندی میں کود جائے یا بڑے سرکار کے آگے سرنگوں ہو جائے۔ وہ ندی کی طرف بھاگی مگر چٹان پھسلتی تھی۔ وہ واپس نیچے گر پڑی۔ اٹھتے اٹھتے اس نے مڑ کر دیکھا تو بڑے سرکار سر پر آن پہنچے تھے۔ وہ اٹھنے لگی مگر وہ پھر جھپٹے۔ ان کا ہاتھ اس کے پیر پر پڑا اور گرفت مضبوط ہو گئی۔

اس نے بہت کوشش کی مگر ان کی آہنی گرفت اور سخت ہوتی گئی اس کا پیر پکڑے وہ سسکیوں سے رو رہے تھے اور پاگلوں کی طرح چوم رہے تھے۔

"چاندنی میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ چاندنی۔ رحم کر میں دیوانہ ہو جاؤں گا چاندنی۔"

نفرت اور غصے کا ایک بے پناہ طوفان چاندنی کے دل میں اٹھا' جھک کر اس نے ایک بھاری سا پتھر اٹھایا کہ سانپ کا پھن کچل ڈالے کہ سامنے چندر چٹان پر چڑھتا دکھائی دیا۔ پتھر اس نے واپس پٹخ دیا۔ اور اس کی جان میں جان آگئی۔ وہ اپنا منہ ڈھانپ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ آخر چندر نے اس کی یہ درگت دیکھ لی۔

"اگر تو نے فیصلہ کر لیا ہے تو پھر ٹھیک ہے' مگر یاد رکھنا میرے ہاتھ چندر کے خون میں ڈوب جائیں گے۔" بڑے سرکار اپنی دھن میں بک رہے تھے' انہیں چندر کے وجود کا شبہ بھی نہ تھا۔

"سن رہے ہو چندر جی اپنے پتا سمان بھائی کی باتیں؟ لو اپنے کان سے سن لو۔"

"بھیا!" چندر نے پکارا اور تیزی سے چڑھنے لگا۔

ایک دم جیسے بڑے سرکار کے جسم کی ساری طاقت سلب ہو گئی۔ ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور پسینے کے فوارے چھوٹ نکلے وہ پٹے ہوئے کتے کی طرح ایک طرف دبک گئے۔

مگر پل بھر بعد جب انہوں نے سر اٹھایا تو وہ بھوت جو گھڑی بھر پہلے درندوں کی طرح دانت نکوس رہا تھا غائب تھا۔ اس کی جگہ وہی دیوتا سمان بڑا بھائی واپس لوٹ آیا۔ وہی آنکھوں میں نرمی اور سنجیدگی اور وہی لہجے کی نرمی۔ وہی بڑے سرکار جو ایک چھوٹے انسان تھے۔ مگر عظیم الشان دھوکہ تھے۔

"رحم کر چاندنی' میرے اوپر دیا کر۔ تجھے جائیداد چاہئے تو وہ تو لے سکتی ہے۔ میرا اور بھو کا حصہ بھی لے لے۔ مگر بھگوان کے لیے تو چندر کو چھوڑ دے۔ میں نے اپنی ماں کو مرتے سے وچن دیا تھا کہ اگر چندر کی رکشا کرتے میری جان بھی چلی گئی میں سمجھوں گا کہ میرا جیون سپھل ہو گیا۔"

چاندنی کا منہ فق ہو گیا' حلق میں کانٹے پڑنے لگے اور زبان تالو سے چمٹ گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑے اس بہروپیے کو تکتی رہ گئی۔

"بھیا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" چندر نادم ہو گیا۔

"میں چاندنی سے تیرے جیون کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ بھیا تو کتنا ننھا سا تھا—— ماں نے تیرا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر کہا تھا۔ "مجھے وچن دو کہ چندر کی رکشا کرو گے۔" ماں کی آتما اشانت ہو جائے گی۔ تب میں جی کر کیا کروں گا؟" بڑے سرکار نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔

ایک دم چاندنی نے اپنا پیر گھسیٹ لیا اور دوڑ کر چندر کا گریبان تھام لیا۔

"یہ پاکھنڈی ہے چندر جی' اس کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ سب ناٹک ہے' سب جھوٹ—— ابھی ابھی یہ تمہاری جان لینے کی دھمکی دے رہا تھا۔ یہ مجھ سے چندر جی—— پاپی مجھے——"

"چاندنی پاگل ہو گئی ہے؟" چندر نے اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈر کر کہا۔ وہ بڑے بھیا کی شان میں اتنے بھیانک الفاظ سننے کا عادی نہ تھا۔

"میں پاگل ہوں اور تو بڑا ہوشیار ہے! چندر تو نرا کاٹھ کا الو ہے——"

"بکواس نہ کر چاندنی ورنہ اتنی زور کا طمانچہ ماروں گا کہ منہ پھر جائے گا—— جو منہ میں آتا ہے بکے چلی جاتی ہے۔"

چاندنی نے ایک بار بڑے سرکار کے دیوتا سمان روپ کو دیکھا اور پھر بھولے بھالے چندر پر نظر ڈالی اور نظر ڈالی اور بے تحاشا قہقہے لگانے لگی۔

"میں پاگل ہوں اور تم پاگل نہیں۔ میں پاپن ہوں اور تم لوگ دیوتا ہو۔ میرے کارن بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے' میرے کارن سورج ونش کے ماتھے کو کلنک لگ رہا ہے۔" چاندنی نے سسکی بھری۔ پو پھٹ رہی تھی' سورج کے طلوع ہونے کا سے ہو رہا تھا' دور گھاٹی کے سرے پر چاند کا ٹکڑا زرد ہونے لگا تھا' چاندنی دم توڑ رہی تھی۔

"چاندنی نے جھک کر چندر کے چرنوں کی دھول مانگ کو لگائی۔" ایک بار جی بھر کے اس کے ٹکڑے کو تکتی رہی۔ پھر پلٹ کر ندی کی طرف بھاگی اوشا رانی نے اسے روکنا چاہا' پل پر چوکیدا نے چلا کر کہا پل پر نہ جاؤ' بالکل گلا ہوا ہے مگر وہ تیر کی طرح نکل گئی۔ پل ڈگر مگر ہلنے لگا۔ بانس چر چرا کر پانی میں گرے۔

دیوانوں کی طرح بڑے سرکار اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگے۔

"اسے روکو۔۔۔۔۔" وہ اسے موت کے منہ میں دیکھ کر بدحواس ہو گئے۔

"کیا کرتے ہیں سرکار! درجنوں کا بوجھ نہیں سہار سکے گا۔ بھگوان کے لیے رک جائیے۔" پہرے دار نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈالنا چاہا' چندر نے انہیں پکڑنا چاہا مگر ان دیو زاد کی طاقت سمائی ہوئی تھی۔ وہ سب کو جھٹک کر پل پر پہنچ گئے۔

"لوٹ آ چاندنی۔ یہ کیا کر رہی ہے؟" وہ چلائے۔ ایک بانس پیر کے نیچے سے چر آیا اور چاندنی کا پیر گھٹنے تک اتر گیا۔ نکالنے کی کوشش میں تڑا تڑ بانس چٹخنے لگے۔ بڑے سرکار کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اس نے بڑی مشکل سے پیر کھینچا اور ایک زقند میں دوسری طرف پہنچ گئی۔ ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ چٹختا اور چنگھاڑتا بانسوں کا بوڑھا پل مع بڑے سرکار کے تیز بہتی ہوئی ندی میں گر پڑا۔

"بڑے بھیا۔ چندر کو معلوم تھا انہیں تیرنا بھی نہیں آتا۔ ندی بڑے زور شور سے پل کے لاشے کو مع بڑے سرکار کے لے کر چل دی۔۔۔۔ باوجود پہرے دار کے منع کرنے کے چندر نے کوٹ اتار کر دور پھینکا اور پانی میں کود پڑا۔

ہفتہ بھر تک بڑے سرکار موت سے لڑے رہے۔ چندر نے اپنی جان پر کھیل انہیں بچا ہی لیا۔ ان کے سر اور ماتھے میں کئی ٹانکے آئے تھے۔ بخار اب ذرا کم ہونے لگا۔ گو ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اب کوئی خطرہ نہیں مگر اوشا رانی ایک پل کے لیے بھی ان کی پٹی سے الگ نہ ہوئی۔ بہت نیند آتی تو گھڑی بھر کے لیے وہیں

سر ٹکا کر سو جاتیں۔ بڑی مشکل سے چندر اور بہو انہیں کچھ کھلا پلا دیتے۔ وہ کمرے میں سوائے ڈاکٹروں کے اور کسی کو نہیں آنے دیتی تھیں۔ گھڑی بھر کو کوئی آتا اور جونہی بڑے سرکار بے چین ہو کر برانا شروع کرتے وہ سب کو باہر نکال دیتیں ابھی تک سوائے ان کے اور چاندنی کے کسی کو اصلیت کی خبر نہ تھی۔ منشی جی کو وہ کوئی اہمیت نہ دیتی تھیں۔ چاندنی سے اس نے کہہ دیا تھا کہ کسی سے کچھ کہا تو اچھا نہ ہو گا۔ انہیں اس وقت سوائے بڑے سرکار کی زندگی کے اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔

چاندنی خود اس بری طرح سہمی ہوئی تھی کہ اس کی عقل گم ہو چکی تھی چندر اور بہو سے بھی منہ چھپائے پڑی تھی۔

جب بڑے سرکار کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو اشارے کنائے سے انہوں نے چاندنی کو سمجھانا شروع کیا کہ اب سارے احسانوں کا بدلہ چکانے کا وقت آگیا ہے۔ مگر چاندنی اوشا رانی جیسی باہمت نہ تھی بزار نے اسے سورگ کے سبز باغ دکھائے' دوسرے جنم کے آنند بھرے جیون کا بہلاوا دیا' بلی دان پر لکچر جھاڑے مگر چاندنی مرنے کو تیار نہ تھی۔

"میں یہاں سے کہیں دور چلی جاؤں گی۔"

"چندر تمہارے پیچھے جائے گا۔"

"کیا موت کے سوا میرے بھاگ میں اور کچھ نہیں؟"

"یہ موت نہیں پگلی! تب تو امر ہو جائے گی۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا۔"

تو کیا پھر بھی چندر تجھ سے پیار کرتا رہے گا؟ وہ اپنے پیارے بھائی کی ہتیا کرنے والی کو پتنی بنا سکے گا؟"

"نہیں۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔"

"اگر اس کے بھیا کی جان بچ گئی تو وہ ساری عمر تیری یاد میں تڑپے گا۔ تیری پوجا کرے گا۔"

"تب تو چندر مجھ سے پیار کرے گا؟" چاندنی نے سسک کر کہا۔

"ہاں۔"

"وہ میری پوجا کرے گا۔ میری یاد میں بے چین ہو کر تڑپ اٹھے گا۔"

"ہاں۔"

"تب میں مر جاؤں گی۔"

"میں جانتی ہوں چاندنی تو معمولی بچ لڑکی نہیں' تو دیوی کا اوتار ہے۔"

"ہاں میں دیوی کا اوتار ہوں مگر دیدی---- پل پر مجھے دریا سے بہت ڈر لگا تھا۔ میں مرنے گئی تھی اور نہ مر سکی۔ چاقو سے بہت درد ہو گا اور پھر مجھے تو آتما بھی نہیں چاقو گھونپنا۔ دیدی۔"

"ہاں----"

"تم گھونپ دو میرے کلیجے میں چاقو' یا چندر جی سے کہو وہی میرا گلا گھونٹ دیں" چاندنی رو پڑی۔

"کسی کو مارنا پاپ ہے۔" اوشا کو اپنی جان بھی تو پیاری تھی۔

"آتما ہتیا بھی تو پاپ ہے۔"

"آتما ہتیا پاپ ہے۔ بلی دان تو مہا پن ہے چاندنی۔ میرے پاس ایسا امرت ہے جسے پی کر مزے کی نیند آ جاتی ہے۔"

اور پھر؟

"پھر نیند کبھی نہیں ٹوٹتی۔"

"تمہیں کس نے دیا یہ امرت دیدی؟"

"سرنامیا نے۔ ماتا جی کے بعد میرا بہت جی گھبرایا' میں نے سوچا اس اکیلے پن سے تو اچھا ہے میں ان کے پاس چلی جاؤں' سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔" اوشا رانی نے بات بتائی۔

"پھر تم نے امرت نہیں پیا؟"

"نہیں۔ اسی رات ماں نے سپنے میں آ کر درشن دیے اور بولیں۔ میرے بڑے سرکار کی سیوا تیرا دھرم ہے۔ تیرا جیون مرن ان ہی کے چرنوں میں ہے۔"

"اچھا دیدی ایک بات بتاؤ گی؟"

"پوچھو۔"

"جو میں یہ امرت پی لوں تو اپنی ماں کے پاس پہنچ جاؤں گی۔"

"مر کر تو سب ہی مل جائیں گے۔"

"تو لاؤ دیدی وہ امرت مجھے دے دو۔ میں اپنی ماں کے پاس پہنچ جاؤں گی' ان کی گود میں سر ڈال کر آنکھیں بند کر لوں گی' پھر ان سے پوچھوں گی۔ ماں' میں نے کون سا پاپ کیا تھا جو تو مجھے کوڑے پر پھینک کر چل دی؟ مجھے کلیجے سے لگا لے۔ مگر دیدی میں اسے پہچانوں گی کیسے؟ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔"

"مرنے کے بعد سب پہچانے جائیں گے۔" اوشا نے بٹوے سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ "پر کون جانے شاید میرے ماتا پتا زندہ ہوں' پھر میں اکیلی کہاں بھٹکتی پھروں گی۔"

"زندہ ہوتے تو تجھے یوں پھینک کر کیوں چلے جاتے؟"

"نہیں وہ مجھے پھینک کر نہیں گئے' ضرور میں کھو گئی ہوں گی کوئی چور لٹیرا اٹھا کے مجھے وہاں ڈال گیا ہو گا اور انہوں نے رو رو کر برا حال کر لیا ہو گا۔ کون جانے وہ اب بھی ڈھونڈ رہے ہوں مجھے دیدی رانی کیا میرے ماتا پتا کا کھوج نہیں مل سکتا؟ اور شاید میرے بھائی بھی ہوں اور مجھے دنیا بھر میں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں' ہائے دیدی میرا دل کہتا ہے کہیں میرا ایک بھیا ضرور ہو گا۔ ہائے رام اسے پتہ بھی نہیں کہ اس کی ابھاگن بہن کہیں پڑی اپنے نصیب کو رو رہی ہے۔" چاندنی کی ہچکی بندھ گئی اپنے اکیلے پن کا احساس بری طرح ڈسنے لگا۔

اوشا اس کی بکواس سے اکتا کر چلی گیں۔ وہ شیشی کو مٹھی میں بھینچے چپ چاپ روتی رہی۔ چندر کی آواز سن کر اس کا کلیجہ اچھل کر منہ کو آ گیا۔ وہ اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کی پکار نے پھر جینے کی امنگ کو جگا دیا ہائے وہ بیتے ہوئے پیار کے دن موت سے دور گنگناتی گاتی زندگی کے دن! جو خواب ہو کر مٹ گئے۔ چندر اسے پکار کر خاموش چلا گیا۔ وہ گیلری کے کونے میں خاموش دبک گئی۔ سارا گھر چین کی نیند سو رہا تھا' وہ اکیلی جاگ رہی تھی۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایک انسان اتنا دکھ جھیلتا ہے اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی!

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ بڑے سرکار کے ڈراؤنے حلیے کو دیکھ کر خوف سے چیخیں مارنے لگتی مگر اس وقت جب اس نے انہیں گیلری کی طرف آتے دیکھا تو نہ اس کا خوف سے دل دھڑکا نہ چیخ نکلی۔ قریب آ کر وہ مجرموں کی طرح آنکھیں نیچے کیے ڈھیلے ہاتھ چھوڑے کھڑے رہے۔ ایک دم چاندنی کو اپنے مرتبے کا احساس ہوا۔ وہ بہت بلند ہے' قربانی دینے جا رہی ہے۔ آج اس کی مٹھی میں امرت ہے۔ اب کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ نہ بڑے سرکار کا پیار' نہ چندر کی نفرت اسے کسی سے واسطہ نہیں' کسی سے کچھ لینا دینا نہیں۔

"آپ مجھے چاہتے ہیں؟" اس نے دلیری سے تن کر کہا۔

"ہاں!" بڑے سرکار کی آواز مرگھٹ میں شائیں شائیں کرتی ہوئی ہوا کی طرح

سرسرائی' ان کا سارا جسم لرزنے لگا۔ آنکھیں بند کیے دیوار سے ٹک گئے۔

"آپ مجھ سے وعدہ کریں گے۔" اس نے دانت پیسے۔

"ہاں۔" انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"تو کر لیجیے۔" چاندنی کی آواز سپاٹ اور بے جان تھی۔

"تم--- تم---" بڑے سرکار وحشت سے گھبرا کر اپنا گلا دونوں ہاتھوں سے نوچنے لگے۔

"ہاں میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"انہوں نے ڈرتے ڈرتے اس کے شانے کو چھوا' شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ خواب ہے یا حقیقت۔ کندھے سے ان کا ہاتھ ٹھٹکتا ہوا اس کے بھیگے ہوئے رخسار پر پہنچا۔ وہ ایسے جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹے جیسے انہوں نے انگاروں پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

"تم---- تم---- میرا کھیل بنا رہی ہو۔" انہوں نے سہم کر چاندنی کو دیکھا۔ وہ چاندنی جو ہمیشہ انہیں دیکھ کر دھواں دھواں ہو جاتی تھی بڑے وقار سے انہیں گھورتی رہی۔ مٹھی کھول کر اس نے امرت کی شیشی کو پیار سے دیکھا اور مسکرا پڑی۔ بڑے سرکار حیرت سے اسے تکتے رہے' پھر ایک دم اسے کھینچ کر اس کی آنکھوں میں اپنے سوال کا جواب تلاش کرنے لگے مگر چاندنی کی آنکھوں میں انہیں کوئی راستہ نہ ملا' نڈھال ہو کر وہ گرنے لگے۔

موت قریب ہو تو پھر دل کا میل سب دھل جاتا ہے' ان کی یہ دشا دیکھ کر چاندنی کا جی بھر آیا۔ بڑے سرکار ڈھونگی نہ تھے تو پھر کیا تھے؟ ایک عجیب قسم کی ممتا سے لبریز ہو کر اس کا جی بیٹھنے لگا۔ اس نے اپنے دونوں سرد ہاتھ ان کی سلگتی ہوئی کنپٹیوں پر رکھ دیے اور سر کلیجے سے لگا لیا۔ ان کے جلتے ہوئے ماتھے کے لمس سے اس کے ہونٹ جھلس گئے۔

"چاندنی۔" چندر احمقوں کی طرح اس نرالے ڈرامے کو دیکھ کر آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ چاندنی نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا مگر بڑے سرکار تڑپ کر دور ہٹ گئے۔ چندر کی آنکھوں میں انہوں نے اپنی بڑائی اور پاک دامنی کا جنازہ دیکھ کر آنکھیں شرم سے جھکا لیں اور خشک پتے کی طرح لرزنے لگے۔

"چندر جی ہمارا دولہا ہو رہا ہے۔" چاندنی جان پر کھیل کر چندر کا مذاق اڑانے لگی۔ ایک ہی زقند میں وہ ناسمجھ بچی سے بوڑھی ہو گئی۔

"تم نے دولہا کو دیکھا؟"

"تو پاگل تو نہیں ہو گئی ہے؟" چندر نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلا ڈالا مگر وہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔

"مجھے ہاتھ نہ لگاؤ چندر جی' نہیں تو یہ ریت کا محل ایک آن میں ڈھے پڑے گا۔ میری طرف ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں بھسم ہو جاؤں گی۔" اس نے لجاجت سے کہا۔ "کیوں کھنڈت ڈال رہے ہو۔"

"اسے کیا ہو گیا ہے؟ بھیا آپ۔"

"ہم---- ہم سورج ہیں۔" بڑے سرکار جھومنے لگے' "اور یہ---- یہ چاندنی ہے---- دیکھا۔ دیکھا تم نے؟ دنیا کتنی جھوٹی ہے کہ سورج اور چاندنی کا کبھی ملن نہیں ہو سکتا! یہ سب بکواس ہے۔ کیونکہ---- کیونکہ اصل میں ہمارا نام سورج نہیں چاند--- چاند ہے۔"

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں بھیا۔"

"ہماری طبیعت بالکل ٹھیک ہے کیونکہ ہم۔ ہمارا نام سورج نہیں۔"

"اوشا رانی چیل کی طرح چلاتی زینے پر سے اتریں۔"

"نرودئی' بے شرم' تو اس دو پیسے کی چھوکری کے کارن اپنے بڑے بھائی کا اپمان کر رہا ہے۔ دیکھ تو ان کی کیا دشا ہو گئی ہے۔ دیکھنے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے اور تو ان کی جان لینے پر تلا ہوا ہے۔"

"دیدی۔"

"کر چپ رہ۔ تیرے لیے انہوں نے کیا نہیں کیا؟ اپنی جوانی خاک میں ملا دی کہ جب تک چندر اور ہم اپنے پیروں پر نہ کھڑے ہوں۔ وہ کیسے سکھ کی نیند سو سکتے ہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو تجھ جیسے نکمے کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینکتا مگر انہوں نے کبھی تجھے ٹیڑھی آنکھ سے نہ دیکھا' کبھی اونچی آواز سے نہ بولے اور تو ہے کہ سر پر چڑھا چلا آتا ہے۔" انہوں نے بڑے سرکار کو سہارا دے کر آرام کرسی پر بٹھا دیا۔

"میں نے---- میں نے کیا کیا؟ چندر کو ایسا معلوم ہوا ان سب کے ساتھ اب وہ بھی پاگل ہو جائے گا۔

"تو نے کیا نہیں کیا؟ تو ہی اس بلا کو گھر میں لایا۔ بول لایا کہ نہیں؟" اوشا نے سوچا چندر کو دبانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے بولنے نہ دیا جائے۔ "تیری ضد پر اس ناگن کو پالا پوسا' کسی چیز کی کمی رہی اسے؟ گھر کی بیٹی سے بھی زیادہ ٹھاٹ باٹ

ٹکرائے' اور آج یہ بے شرم اس احسان کا بدلہ دے رہی ہے کہ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے مگر کان کھول کر سن لو۔ میرے جیتے جی اس پریوار کا سرد ناش نہ ہونے پائے گا۔ مجھے اپنے خون کی آہوتی دینا پڑی تو اس سے بھی انکار نہ ہو گا۔ میں نے بھی اس گھر کا نمک کھایا ہے۔ نمک حرامی نہ کروں گی نہ کرنے دوں گی۔"

"افوہ! دیدی بات تو سنو۔ میں ابھی یہاں آیا تو دیکھا۔"

"دور ہو' مجھے دیدی نہ کہہ۔ جسے اپنے دیوتا سمان بیچارے ناچار بھائی پر دیا نہ آئے وہ مجھ بے سہارا لاوارث کا کیا آدر کرے گا۔" اوشا رو پڑیں۔

"ساری دنیا کو ان سے ہی شکایت ہے۔ تو چاندنی سے پوچھ۔

"مجھے کسی سے کچھ نہیں پوچھنا۔" چندر نے نفرت سے کہا۔

"چندر جی۔" چاندنی نے اسے کبھی اتنا گمبھیر نہیں دیکھا تھا' تڑپ گئی۔ چندر جاتے جاتے رک گیا۔

اوشا نے خونی نظروں سے چاندنی کو گھورا اور اس کی آنکھوں میں زندگی دم بھر کے لیے جاگ کر پھر دم توڑنے لگی' اس نے تھک کر گردن ایک طرف ڈال دی۔

"ہاں چندر جی مجھ سے پوچھو--- مگر تم ابھی بہت ننھے ہو' تم نے پریم کی جوالا میں بھسم ہو کر مسکرانا نہیں سیکھا' تم کیا سمجھو گے؟"

"تم---- بڑے بھیا----" اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"ہاں' امرت سے کسے پیار نہیں؟" اس نے اپنی مٹھی کو کھول کر ننھی سی شیشی کو چوما۔

"تو اتنے دن مجھے کیوں دھوکے میں رکھا؟"

"جیون ایک دھوکا ہی تو ہے۔ بس میٹھی نیند کے بعد سب مل جائیں گے۔ تب میں سو جاؤں گی۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔"

"اور مجھے بیوقوف بناتی رہی کہ ان سے تجھے ڈر لگتا ہے' وہ تجھ سے نفرت کرتے ہیں' مار ڈالنا چاہتے ہیں۔" چندر کی زبان میں زہر بھر گیا۔

نفرت اور پیار کا بھید کون جان سکتا ہے؟ اور نہ بھاگ میں جو لکھا ہے اسے کوئی مٹا سکتا ہے۔ یہی ہونا تھا' ہونی پر آج تک کسی کا بس چلا ہے؟"

"ہونی اور نصیب کا سہارا نہ لو' صاف کہہ دو کہ رانی بننے کا ارمان تھا سو پورا ہو گیا۔ میں---- میں بدھو ہوں نا---- چھچھورا---- سب سے ڈر جاتا ہوں۔ ہنہ! تو کیا سمجھتی ہے یہاں کوئی تیرے لیے مر جائے گا؟" چندر کی رگوں میں

جوانی کا گرم اور خوددار خون سنسنا رہا تھا۔

"ٹھیک کہتے ہو' رانی بننا چاہتی تھی سو بھور ہونے سے پہلے ہی بن جاؤں گی' ہاں تم بدھو بھی ہو اور ڈرپوک بھی۔ بڑے سرکار کے سامنے چوہے کی طرح دبک جاتے ہو۔ ان کے چرنوں کی دھول بننے یوگ بھی نہیں اور میں کوئی پاگل ہوں جو سوریہ دیوتا کو ٹھکرا کر ان کی چھایا پر جگمگانے والے چندر ماں سے ماتھا پھوڑوں گی--- یہ---- یہ دیوتا ہیں' مہاپرش ہیں اور تم؟ تم کچھ بھی نہیں۔" اپنے دکھ کا بدلا وہ چندر سے لینے لگی۔

"چڑیل بھیا کا سہارا پا کر تو سر پر چڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ٹھیک ہی کہتی تھی ماسی۔ موری کی اینٹ سے ٹھوکر لگی تو سارا شریر گندہ ہو جائے گا۔ تیرا بیاہ ہو رہا ہے' چل جا چولہے میں۔" چندر جانے لگا۔

"چندر مجھے--- مجھے جاتے سے آشیرواد تو دے۔"

"لے آشیرواد!" چندر نے مڑ کر ایسا زور کا تھپڑ رسید کیا کہ سوکھی ماری چاندنی دیوار سے جا کر ٹکرائی۔

"ہائے نردئی۔" اوشا کا دل پتھر کا نہ تھا۔ بڑے سرکار جو نیم بیہوش پڑے تھے تڑپ کر اٹھ بیٹھے مگر اوشا نے انہیں روک دیا۔

"رہنے دو دیدی' اس نے اچھا کیا جو مجھے مارا۔ اب میری یاد میں تڑپ تڑپ کے روئے گا تب پتہ چلے گا۔ چاندنی سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

"میں تجھے یاد کروں گا کمینی! میں تو تیری صورت پر تھوکوں گا بھی نہیں۔"

"ایسے بول منہ سے نہ نکالو چندر جی' کہیں بعد میں پچھتاوا آئے اور سر پکڑ کر روؤ۔" اوشا ندامت سے بے قرار ہو گئیں۔

"اگر غصے میں کچھ کر بیٹھی تو اس کا خون تمہاری گردن پر ہو گا۔" اوشا نے ساتھ ساتھ اپنا گناہ بھی اس کے سر منڈھنے کی ترکیب نکال لی۔ صبح چاندنی کی لاش دیکھ کر سب یہی سمجھیں گے۔ چندر سے لڑ آئی ہوئی تھی' غصے میں کچھ کھا کر مر گئی۔

"سر پکڑ کر رونے کے لیے تو تم پیدا ہوئی ہو اوشا رانی تمہیں بہن کہہ کر میں اس پوتر شبد کا اپمان نہیں کرنا چاہتا۔ تم عورت نہیں سماج کے اصولوں کی کچلی ہوئی لاش ہو۔ تمہیں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ پتی کی سیوا تمہارا دھرم ہے' مگر یہ تو تمہارے پتی بھی نہیں! ویسے بچپن سے انہیں اپنا پتی مانتی آئی ہو۔"

"چندر۔"

"تم بھارت ورش کی ستری جسے ایک بار پتی مان لیا اسی کے ساتھ ستی ہو جاؤ گی۔ چاہے وہ تمہاری بوٹیاں کر کے کتوں کو کھلا دے تم اس کے چرن دھو دھو کر پیتی رہو گی۔ تم عورت نہیں لونڈی ہو۔" وہ مڑ کر جانے لگا۔

"ٹھیرو----" بڑے سرکار کی آواز پر بچپن سے اس نے چونک پڑنا سیکھا تھا' بے ساختہ ٹھٹک گیا۔

"کرن سے معافی مانگو۔" انہوں نے سختی سے کہا۔

"کرن؟"

"ہاں' یہ چاندنی نہیں' آج سے اس کا نام سوریہ کرن ہے۔"

"آہاہا--- بہت اچھے۔

"بدتمیزی نہ کرو۔ معافی مانگو' ورنہ----"

"ورنہ------"

"تمہیں یہ گھر چھوڑ کر جانا ہو گا۔"

"آپ سمجھتے ہیں مجھے اس گھر میں رہنے کا شوق ہے؟ مگر یہ نہ سمجھئے گا میں کسی سے ڈر کے جا رہا ہوں' مجھے اس گھر سے وحشت ہو رہی ہے۔"

"کرن' چندر کو معاف کر دو' وہ نادان ہے۔"

"چندر نادان ہے' آپ گیانی ہیں!"

"چاندنی جاؤ اپنے کمرے میں' تمہیں آرام کرنا چاہیے۔" اوشا نے کہا۔

"ہاں---- اوشا دیدی بھی گیانی ہیں' انہیں سب معلوم ہے کہ کیا کرنا چاہیے' کس وقت جاگنا چاہیے' کس کو جینا چاہیے اور کس کو مر جانا چاہیے" وہ بڑبڑاتی جانے لگی۔

بڑے سرکار نے ندیدوں کی طرح مدہوش چاندنی کو گھورا۔ اس کا دوپٹہ ڈھلکا ہوا تھا۔ ہوا کے ایک جھونکے سے کپڑے جسم سے چپک گئے' وہ تڑپ کر اس کی طرف لپکے۔

"نہیں----" اس کا پرانا خوف جاگ اٹھا۔ اوشا کی دبی ہوئی سسکاری سن کر اس کا جی چاہا ان کا منہ نوچ لے۔ وہ اس کمینے جانور پر کیوں اس بری طرح لٹو ہیں۔

"شادی کا انتظام کیجئے۔ سب تیار ہو جانا چاہیے کوئی کسر نہ رہ جائے۔" اس نے جاتے جاتے کہا۔

وہ کمرے میں پہنچی تو ہمو اور چندر باتیں کرتے ہوئے گیلری سے گزر رہے تھے۔

"سنو تو چھٹ بھیا۔" ہمو اس کے پیچھے بھاگی جا رہی تھی۔

"اب ہمو بھی اس کے منہ پر تھوک دے گی۔" وہ خاموش کھڑکی کے پاس جا کر دور سنگلاخ چٹانوں کو تکنے لگی۔ ہمو مرے مرے قدموں سے واپس آئی اور خاموش اسے تکنے لگی۔ ہمو جو اس کی گوئیاں تھی' اس کی ہمراز تھی مگر چندر کو دیوانہ وار چاہتی تھی۔

"مگر ہمو کچھ نہ بول سکی' چپ چاپ الماری کھول کر کپڑے نکال کر سوٹ کیس میں ڈالنے لگی۔"

ایک بار تو جی چاہا ہمو کے گلے میں باہیں ڈال کر سب کچھ بتا دے ورنہ وہ مر گئی تو اصل وجہ اسے اور چندر کو کون بتائے گا؟ پھر چندر اس کی پوجا بھی نہ کرے گا' اسے بھول جائے گا' وہاں موت وادی میں اتنا بھی سہارا نہ ہو گا۔

اس نے شیشی کو دیکھا اور بٹوے میں رکھ دیا۔ نہیں وہ ایسے نہیں مر سکتی۔ وہ دیر تک سر جھکائے کاغذ پر کچھ لکھتی رہی اور اسے آنسوؤں سے مٹاتی رہی۔

"چندر سب ٹھیک ہو جائے گا' وقت آنے پر سب معلوم ہو جائے گا۔" اوشا نے اس کے سوٹ کیس میں کپڑے رکھتے ہوئے کہا۔

"زندگی میں اب ٹھیک ہونے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔"

"بہت جلد تم لوگ پھر لوٹ آؤ گے۔"

"میں مر کر بھی یہاں واپس نہیں آؤں گا۔"

"کہیں بھائی ایک دوسرے کو سدا کے لیے چھوڑ سکتے ہیں؟ تم نہیں جانتے اس وقت وہ کتنے بیمار ہیں۔ میں جو کہتی ہوں کہ۔"

"آپ جو کہتی ہیں وہ نہ کبھی میری سمجھ میں آیا اور نہ آئے۔ آپ انسان نہیں پتھر ہیں۔ وہ آپ کی اتنی ناقدری کرتے ہیں اور آپ ہیں کہ مری جاتی ہیں اور آج تو آپ نے حد کر دی' ہنسی خوشی انہیں دوسری عورت کو دان دے رہی ہیں۔"

"میں نے انہیں کسی کو نہیں دیا اور نہ میرے جیتے جی کوئی انہیں مجھ سے چھین سکتا ہے۔ اس بیماری میں میں انہیں یم دوت سے چھین کر لائی ہوں مگر تم کو کیسے بتاؤں' خیر---- ایک دن سب کچھ سامنے آ جائے گا--- اسی میں اپنی اور

خاندان کی بھلائی ہے۔ لو یہ چیک' چاچا جی سے کہنا کیش کرا دیں گے' میں موٹر نکلواتی ہوں۔ اور دیکھو' ہمو کا جی نہ چھوٹا ہو۔ یوں تمہیں پریشان دیکھے گی تو چھپ چھپ کر روئے گی۔"

"دیدی میں کتنا برا ہوں' تمہیں کیسے کڑوے بول سنا ڈالے۔" معاف کر سکو گی! چندر نے دیدی کے پیر تھام لیے۔

"ارے کیا کرتا ہے بھیا! دیوانہ ہوا ہے! میں تیری بات کا برا کیسے منا سکتی ہوں۔"

"ماں تو بچپن ہی میں روٹھ گئیں' آپ نے ہی ماں کے سکھ دیے خیال تھا ایک دن آپ اور بھیا---- دیدی' میرا خون کھول رہا ہے کیا کروں کچھ بس نہیں چلتا' تم اب یہاں کیا کرو گی؟"

"یہ میرا گھر ہے۔" اوشا مسکرائیں۔

"میرا کہا مانیئے' اب یہاں آپ کی گزر نہ ہو گی' ہمارے ساتھ چلیے' وہاں مزے سے رہیں گے۔"

"میری تو اب ارتھی ہی اس گھر سے نکلے گی۔ بھیا' تم میری اوپر وشواش رکھو۔ مگر دیکھو ایسی ویسی خبر سن کر جی کو بے قابو نہ کر لینا۔"

"کیسی خبر دیدی؟" چندر سہم گیا۔

"شادی کی۔" اوشا ہنسیں۔

"ارے ہائے' مجھے تو اس کی صورت سے نفرت آ رہی ہے۔"

"نہیں چندر----" وہ رک گئیں۔

"کیا؟"

"کچھ نہیں----- میں ناشتہ بھجواتی ہوں۔"

اوشا نے ہمو کو پیار کیا۔ چندر کا جی بہلانے کی ہدایت کی اور دونوں کو رخصت کیا۔

"ہمو---- ہمو----" چاندنی ہانپتی کانپتی سڑک تک بھاگ گئی۔ ہمو رانی جا رہی ہے۔ موٹر رکی تو اس نے کھڑکی سے جھانک کر کہا اور ڈرتے ڈرتے اس کے گال پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہمو کے آنسو بہہ نکلے اور اس سے منہ پھیر لیا۔ چندر نے موٹر چلانے کو کہا۔

"ہمو---- ہمو جی ایک دفعہ میری طرف تو دیکھ لو--- پھر نہ ملوں گی۔ ہمو

----" وہ موٹر کے ساتھ بھاگنے لگی۔ ٹھوکر لگی اور وہ کنکریلی سڑک پر گر گئی۔

مومی موتیوں کی مالا جو چندر نے اسے جنم دن پر ہار کے بجائے دی تھی ٹوٹ کر بکھر گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کنکروں کو گھورنے لگی۔ ایک دم کنکر پگھل کر موتی بن گئے اور اس کا سر نیچے ٹک گیا۔

حویلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا' جیسے کوئی موت ہو گئی ہو۔ چاندنی اپنے کمرے میں خاموش بیٹھی رہتی۔ اب تو اسے کسی سے ڈر بھی نہیں لگتا تھا۔ ہمو کی چیزیں بکھری دیکھ دیکھ کر کلیجہ کٹنے لگتا' چندر کے کمرے میں جاتے وحشت ہوتی' گئی گزری باتیں یاد آ جاتیں۔

نہیں وہ آسانی سے نہیں مر سکتی' بڑی دھوم دھام سے مرے گی۔ بس وہ صرف اس لیے زندہ تھی کہ بڑے سرکار کی اصلیت دنیا پر کھل جائے۔ اس کے علاوہ ایک ننھی سی امید کی کرن اب بھی جگمگا رہی تھی۔ وہ خط جو اس نے چندر کے کوٹ میں ڈال دیا تھا اسے پڑھ کر شاید وہ اس پر اعتبار کرے' تب وہ بڑی خوشی سے اس کے ہاتھوں میں دم توڑ دے گی۔

"اوشا نے اسے اپنا وچن یاد دلایا تو وہ چڑھ گئی۔"

"دیدی میں نے مرنے کا کھیل کبھی نہیں کھیلا۔ مجھے بار بار نہ ٹوکو' مجھے آپ ہی مرنے دو۔ ویسے تمہارا جی چاہے تو میرا گلا گھونٹ دو یا زبردستی وش پلا دو۔" اوشا کو فکر مند دیکھ کر ہنس پڑی۔

"تم میرے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتیں کیونکہ تمہارے ہاتھ تو مہندی رچانے کے لیے بنے ہیں۔ میرے مرنے کے بعد جب سب مجھے بھول جائیں گے تو بڑے سرکار سے تمہارا بیاہ ہو گا۔ ویسے تم نچنت رہو' میرے بھاگ میں تو موت ہی لکھی ہے۔"

انہوں نے ذرا زیادہ زور دیا تو وہ بیچ بیچ انہیں پھٹکار سنا بیٹھی۔

"میں بڑے سرکار سے کہہ دوں گی۔" اس نے دھمکی دی۔

اور اوشا رانی کو اس کی خوشامد میں خاموش رہنا پڑا۔ مگر وہ جان جان کر اسے موت کی خوبیاں اور قربانی کی بڑائیاں سناتیں' دکھ بھرے بھجن گا کر اس کا اور دم گھونتیں کہ بعض وقت وہ چندر کا انتظار کیے بنا مرنے پر تیار ہو جاتی مگر پھر درد کہیں

ریل کی سیٹی کوک اٹھتی اور اسے آس بندھ جاتی کہ بس اس گاڑی سے چندر آ جائے گا' پھر سب کچھ جی اٹھے گا۔

اوشا رانی کے اعصاب پر اتنا دباؤ پڑ رہا تھا کہ وہ باولی سی کونوں کھتروں میں بیٹھی سرنا دیوی کے بتائے منتروں کا جاپ کیے جاتیں۔ تین دن سے برت تھا اور سوائے چٹکی بھر پرشاد اور دو گھونٹ پانی کے کچھ منہ میں نہیں ڈالا تھا۔ رات رات بھر جاگنے سے ان کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے مگر من پریم کی جوت سے نور نور ہو رہا تھا۔

بڑے سرکار کے احباب دوست تھے ہی کون؟ ان کے ہم عمر تو اپنی اپنی اولادوں کی شادیوں میں لگے تھے۔ کسے معلوم تھا کہ وہ اس عمر میں شادی کریں گے اور وہ بھی اوشا رانی کو چھوڑ کر ایک گمنام لڑکی سے شادی کی تیاریاں بڑے سرکار عجب بوکھلاہٹ سے کر رہے تھے۔ اوشا رانی ہی گھر کی کرتا دھرتا تھیں۔ جب دن قریب آنے لگے تو ان پر بری طرح ہول سوار ہو گیا۔ کہیں چاندنی انہیں جل نہ دے جائے! پھر ان کا کیا بنے گا؟ انہیں گھر سے نکال باہر کر دے گی تو وہ کہاں جائیں گی؟ کس کے آگے ہاتھ پھیلائیں گے؟

چند سال پہلے جو من میں ہر دم جوالا مکھی دہکتی رہتی تھی۔ اب تو وہ بھی ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ رومان اب تو دال روٹی کا سوال بن کر رہ گیا تھا۔ ماسی زندہ تھیں تو کتنا بڑا سہارا تھا۔ ٹھنڈائیاں پلا کر بھگوان کی اور دھیان لگانے کی نصیحت کر کے انہوں نے اوشا کو کچھ ایسے تربیت دی تھی کہ قدرت نے بھی سہارا دیا اور انہیں آہستہ آہستہ من مارنے کی عادت سی پڑ گئی' مگر پیٹ کی آگ اور خود داری تو ابھی زندہ تھی۔

شادی کا ہنگامہ شروع ہو گیا اور چندر نہ آیا اس نے چاندنی کی ساری خوشامدوں کا جواب خاموشی سے دیا۔ چاندنی کی ساری امیدیں موت کی آغوش میں جا سوئیں۔گ

منڈپ کی آگ دھونکی جا رہی تھی۔ چاندنی کو سارا ماں کا زیور پہنا دیا گیا۔

چاندنی کا پلو ٹھیک کرنے کے بہانے وہ اس کے پاس گئیں۔

"لگن کا سمے ہو رہا ہے!" انہوں نے بسور کر کہا۔

"جانتی ہوں دیدی' تم اطمینان رکھو۔"

"اب اطمینان کا ہے نہیں۔"

چاندنی نے بنے سورے بڑے سرکار کو دولہا بنے دیکھا اور ایک آہ بھر کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ آخری گاڑی کا وقت بھی نکل چکا تھا۔ نہیں کوئی نہیں آیا اور کوئی نہیں آئے گا!

اوشا نے ایک شربت کا گلاس اس کے سامنے رکھ دیا چاندنی نے بٹوے میں سے شیشی نکال کر گلاس میں الٹ دی۔

"بس اب تو تمہیں اطمینان ہو گیا۔"

اوشا نے نگاہیں جھکا لیں۔

"دیدی تم چندر اور ہمو کو سب کچھ بتا دوں گی نا؟"

"ہا۔۔ ہاں۔۔" انہوں نے وعدہ کیا۔ "اچھا جلدی کرو۔"

"جلدی کی ایسی کیا ضرورت ہے؟ ابھی لگن میں دیر ہے۔" بڑے سرکار نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اوشا کا رنگ فق ہو گیا اور وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" وہ جانے لگیں۔

"بڑی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی ہو؟" وہ مسکرائے۔

"نہیں تو۔ مہمان آ رہے ہیں۔۔۔ میں۔۔۔" اوشا کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"ہاں ہاں تم جاؤ' مہمانوں کی دیکھ بھال کرو۔ دیکھو آئس کریم نہ کم پڑ جائے۔ مٹھائی مجھے لگتا ہے ضرور کم پڑے گی' کیوں؟"

"نہیں' کم نہیں پڑے گی۔"

"تمہیں بڑا کام کرنا پڑ رہا ہے۔ اوشا۔"

"نہیں تو۔"

"نہیں کیسے' کتنا اچھا انتظام کیا ہے تم نے! تمہارے اور ماسی کے علاوہ اور کسی میں ہمت نہ تھی۔" وہ لفظ چبا کر بولے۔

"جی۔۔۔" اوشا ہکلائیں۔

"اب سب ٹھیک ہو جائے گا نا؟"

"جی۔۔۔ جی ہاں۔۔۔"

"پھر تمہیں کوئی شکایت نہ رہے گی؟"

"جی نہیں۔" بے ساختہ اوشا کے منہ سے نکل گیا۔

"تو جاؤ انتظام کرو۔" وہ مسکرا کر انہیں گھورنے لگے' بے چاری گرتی پڑتی لوگوں سے ٹکراتی بھاگیں۔

اوشا کے جانے کے بعد بڑے سرکار نے ایک ٹھنڈی سانس بھری' پھر بڑی اداس آنکھوں سے چاندنی کو تکنے لگے' وہ نظریں جھکائے دونوں ہاتھوں میں گلاس پکڑے بیٹھی رہی۔

انہوں نے اپنا گلاس رکھ دیا اور ڈرتے ڈرتے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔ جیسے سانپ نے ڈس لیا' چاندنی نے جلدی سے اپنے ہاتھ پیچھے کھینچ لئے اور منہ ڈھانپ کر سسکیاں گھونٹنے لگی۔

"ارے تم تو شرما رہی ہو۔ بھئی واہ!" وہ مکاری سے مسکرائے' "آج تم خوش ہو نا؟"

اس نے ساری دنیا کی نفرت اپنی مظلوم آنکھوں میں سمیٹ کر انہیں سر سے پیر تک دیکھا "ہاں میں بہت خوش ہوں۔" اس نے جلدی سے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

"ارے اتنی جلدی نہ پیو' اچھو لگ جائے گا۔" وہ ہنسے اور بڑی نزاکت سے اپنا گلاس اٹھا لیا۔ "ایسی بھی کیا جلدی!" وہ بڑے سکون سے گھونٹ لے کر بولے۔

مسرت اور جیب۔ سے مدہوش ہو کر چاندنی ہنس پڑی۔ اس نیڑے سرکار کا ہاتھ نفرت سے جھٹک دیا اور آنکھیں بند کر کے بڑے بڑے گھونٹ لینے لگی۔

اوشا رانی مہمانوں کی طرف تھیں مگر انکا دھیان ایسطرف لگا ہوا تھا وہ خوش ہونا چاہ رہی تھیں مگر ان کا جسم بے قابو ہو کر لرز رہا تھا۔

گلاس ختم کر کے چاندنی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پھر ہنستی رہی' یہاں تک کہ آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو بھی نہ پونچھے۔

"ہاں بڑے سرکار اب میں تمہاری ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھ ان کی طرف پھیلا دیئے۔ مگر وہ اسے دیکھتے رہے' مسکراتے رہے اور گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

ایک دم چاندنی نے دونوں ہاتھوں سے تڑپ کر اپنا گلا پکڑ لیا۔ سامنے پریشان حال چندر کھڑا تھا!

"چندر جی۔۔۔" جب اسے اپنی آنکھوں پر یقین آگیا کہ یہ چندر ہی ہے تو وہ گرتی پڑتی اس کی طرف بھاگی اور اس کے سینے سے چمٹ گئی۔

"تم نے دیر کر دی چندرو۔ میں جا رہی ہوں راجہ۔ میں نے وش پی لیا یہ دیکھو یہ بیٹھے ہیں تمہارے سوریہ دیوتا۔"

"تم آ گئے چندر؟" بڑے سرکار کی آواز میں جیت کی کھنک تھی اور انہوں نے اپنے گلاس میں سے ایک بھرپور گھونٹ لیا۔

چندر نے دیر کر دی۔ ماما جی کے ساتھ وہ اور ہوشکار کو گئے تھے' وہاں سے لوٹے تب لونڈری میں ڈالتے وقت کوٹ کی جیب سے خط نکلا' ورنہ وہ چھ روز پہلے ہی آ جاتا۔

"مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے چندر جی؟" چاندنی نے لرزتے ہاتھوں سے اس کا چہرہ چھو کر کہا۔

"مجھے اپنے سینے میں چھپا لو چندرو۔ میرا کلیجہ جا رہا ہے" وہ اس کے بازوؤں میں بے سہارا ہو گئی۔

چندر نے اسے جلدی سے صوفے پر لٹا دیا' ہو اس کے سینہ پر منہ رکھ کر رونے لگی' مہمانوں میں کھلبلی مچ گئی۔

"ڈاکٹر۔۔۔ ڈاکٹر کو فون کرو منشی جی۔" اس نے چاندنی کی پیشانی کا پسینہ ہونٹوں سے پونچھ دیا۔ "جلدی کرو۔"

"رہنے دو منشی جی' ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں۔" بڑے سرکار کے چہرے پر خبیث مسکراہٹ ناچ رہی تھی وہ مزے سے بیٹھے شربت کی چسکیاں لے رہے تھے' جیسے چاندنی انسان نہیں کیڑا تھی۔

"کمینے بزدل ایک نردوش لڑکی کی جان لے کر مزے سے بیٹھا شیطان کی طرح ہنس رہا ہے۔ ذلیل کتے۔" لپک کر چندر نے بڑے سرکار کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ "مگر تو بھی میرے ہاتھ سے بچ کر کہاں جائے گا؟"

ایک جھٹکے سے انہوں نے چندر کو الگ کر دیا' ایک دم ان کے چہرے پر جلال برسنے لگا' ہمیشہ سے ڈرنے والا چندر پل بھر کے لئے دبک گیا۔

"کیا دیوانوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔" انہوں نے بڑے نرمی سے کہا' "کیا تم نے یہ بھی کہیں سنا ہے کہ بھنورے نے کلی کا گلا گھونٹ دیا۔ یا پتنگے نے دیپک بجھا دیا۔" وہ بڑے وقار سے چلتے ہوئے چاندنی کے پاس گئے ہولے سے اس کے بکھرے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا:

"پگلی--- سمجھتی ہے اس نے پیا ہے زہر---"

"اوشا کے منہ سے ایک دل دوز چیخ نکلی اور وہ گلاس چھیننے جھپٹی مگر بڑے سرکار نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس ختم کر ڈالا۔

اوشا پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہی پھر چیخ مار کر ان کے پیروں سے لپٹ گئی۔

چندر نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں بھینچ ڈالیں اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی۔

چاندنی نے کراہ کر آنکھیں کھولیں؟ بڑے سرکار نے صوفے کا سہارا لیا تو وہ سہم کر چندر سے لپٹ گئی۔

"ہاں چندر اسے بچا لو۔ سورج کے سامنے چاندنی مرجھا جاتی ہے۔ اٹھو اوشا' تمہارے آنسو وش کو اور کڑوا بنا رہے ہیں۔" انہوں نے اوشا کو اٹھانا چاہا' "شما کر دو اوشا رانی! میں نے تمہاری محبت کی قدر نہ کی میں نے تمہارا بڑا اپمان کیا--- جس کی سزا آج مجھے مل گئی۔ تم نے اپنی ساری زندگی میرے لئے بھسم کر دی۔"

"ناتھ' آپ کی سیوا میرا دھرم ہے" "اوشا نے ان کے پیروں پر سر پٹخ دیا' "یہ آپ نے کیا کیا؟"

"جانتا ہوں میں نے جو کچھ کیا۔" اچھا نہیں کیا۔ میں نے چاندنی کو چاہا' اگر میرے دل میں بھگوان کی اتنی لگن ہوتی تو انہیں بھی پا سکتا تھا' مگر چاندنی اور سورج کا میل نہیں ہو سکتا۔" وہ چکرا کر گرنے لگے تو چندر نے لپک کر انہیں بانہوں سے سنبھال لیا۔

"بھیا! ارے منشی جی ڈاکٹر کو فون کیا؟"

"اب ڈاکٹر کچھ نہیں کر سکتا چندر۔"

"مگر بھیا یہ آپ نے کیا کر ڈالا؟"

"اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا چندر۔ اوشا میرے پیر چھو کر مجھے اور گنہگار نہ کرو۔ ایک انسان کو دیوتا بنانے کی کوشش میں اسے حیوان بنا ڈالا۔ چھوٹے چھوٹے جھوٹ بڑھ کر بھیانک پاپ بن گئے اور--- اور---" انہوں نے درد سے تڑپ کر خون کی بڑی سی قے کی۔

بھیڑ کو چیرتا کوئی ڈاکٹر آگے بڑھا مگر انہوں نے روک دیا:

"ڈاکٹر' زندگی کی یہ چار گھڑیاں میرا آخری سرمایہ ہیں' یہ نہ چھینو تم تم مجھے بچا نہیں سکو گے۔ اب تو موت کو بھگوان بھی نہیں ٹال سکتے۔" پھر درد کی شدت سے ان کی آنکھیں پھر گئیں' ناک کا بانسہ مڑ گیا' دم بھر کے بعد پھر اکتی ہوئی سانس آئی۔ انہوں نے دور کھڑی چاندنی کی اور بڑی کوشش کر کے تاکا۔ مرتے مرتے آخری بار ان کی پتلیاں ناچ اٹھیں' خون بھری ہنسی کے ساتھ بڑی شوخی سے بولے!

"پگلی! اسے دیکھو رو رہی ہے! پر وہاں اتنی دور کھڑی کیوں آنسو بہا رہی ہے؟ ادھر آ چاندنی! میرے سینے پر صرف ایک بار پیار سے ہاتھ رکھ دے۔ نہیں--- نہیں تو یہ جنم جنم تک یونہی تڑپتا رہے گا۔" چاندنی تیورا کر ان کے سینے پر گر پڑی۔ بڑے سرکار نے بڑی بے صبری سے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ موت کے دروازے پر پہنچ کر پہلی بار چاندنی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

"آہ' اگر موت اتنی حسین ہوتی ہے تو پھر کیوں نہ ہزار بار جنم لے کر مرنے کو جی چاہے۔" انہوں نے موت اور پیار کی لذت سے بے قرار ہو کر کہا اور اپنے بیجان ہونٹ اس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔

چاندنی تڑپ کر رہ گئی۔ اس کا جی چاہا ان کی چھاتی پھٹ جائے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کی اتھاہ محبت میں ڈوب جائے۔

"رو مت میری جان! آج تو تیرا بیاہ ہے۔ وہ دیکھ سورج ڈوب رہا ہے۔ آج چندرماں کا راج ہو گا اور چاندنی کھل اٹھے گی۔"

مغرب کی سمت سورج کی آخری کرن سسک کر خاموش ہو گئی اور دھیمی دھیمی شرمائی سی چاندنی کسی سہاگن کے کفن کی طرح پھیل گئی!

دِل کی دُنیا

کیسا عجیب اور پراسرار وقت ہوتا ہے جب ایک دم آنکھ کھلے اور یہ پتہ نہ چلے کہ جھٹ پٹا ہو رہا ہے یا پو پھٹ رہی ہے! اپنا سر کدھر ہے اور پیر کدھر! کہاں سوئے تھے کہاں جاگے! اس وقت سر پیر کی سمت معلوم کرنا کتنا ضروری ہو جاتا ہے اگر فوراً نہ معلوم ہوا تو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کھو جائیں گے۔

بچپن میں تو رونا آنے لگتا تھا پھر کسی نامعلوم سمت سے ایک وزنی دھموکہ پڑتا اور ہمیں فوراً اپنے وجود کا اتہ پتہ مل جاتا۔ یک لخت ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگتے اور ہم اپنے وجود کا مزید ثبوت دینے کے لئے فوراً مرغیوں کو کھدیڑنے لگتے یا آپس میں کتے بلوں کی طرح ایک دوسرے سے گتھ جاتے۔ تب اماں ہمیں دفعان ہونے کا حکم دیتیں۔ ہم ہنسی خوشی دفعان ہو جاتے اور باغ میں ادھ کھلی کلیاں چن کر جھولیاں بھرنے لگتے۔

یہاں تک کہ اندھیرا ہو جاتا۔ علی بخش لال ٹینوں کا گچھا صدر دروازے کے ٹاٹ کے پیچھے سے اندر بڑھا دیتے۔ بتیاں اکسا کر لالٹینیں گھر کے کونے کونے میں پہنچا دی جاتیں اور اندھیروں میں کھوئے ہوئے در و دیوار پھر لوٹ آتے۔

پھر چوکیدار سیڑھی پر چڑھ کر صدر دروازے کی چوکور بتی جلا دیتا۔ پودے ایک دم جھجک کر تاریکی میں کھسک جاتے اور ہمارے کرتوں کی جھولیوں میں پھول کھلانے شروع ہو جاتے۔ تب بیکار ہی ڈر لگنے لگتا۔ ایک زرد رو گرگٹ گال پھلائے کچ کچ منہ میں زہر گھولتا پھر سرخ انگارا ہو کر چھلانگیں بھرتا املی کے درخت پر دوڑ جاتا اور ہمارے پیر موم بتیوں کی طرح پگھلنے لگتے۔

اسی سمے دور ترائی میں وہ پراسرار آواز لہراتی سنسناتی پھیل جاتی!

"کانیا توری مرلی بیرن بھئی"۔

ہم بگٹٹ بھاگ کھڑے ہوتے اور صدر دروازے کا پردہ اچھتے گھر میں غوطہ

مار جاتے۔ اور پھولوں سے بھری جھولیاں بڑی بوڑھیوں کی جائے نمازوں پر الٹ کر ہم ان کے آنچلوں میں پناہ گزین ہو جاتے۔

دادی اماں جلدی سے آیۃ الکرسی چھو کرو"

جب دادی اماں کی احمد حسین ولدار حسین کے قوام میں لسی ہوئی چھو ہمارے چہروں پر پڑتی تب کہیں جا کر جان میں جان آتی۔

"کنھیا توری ی ی---- مرلی---- بیرن بھئی" آواز دور دور ہوتی جاتی پھر گم ہو جاتی! صرف ہوا کی سائیں سائیں رہ جاتی۔

ہمارے ابا نئے نئے بدلی ہو کر بہرائچ آئے تھے۔ ہماری دو منزلہ وسیع کوٹھی کے سامنے ہی سید سالار مسعود غازی کی درگاہ تھی۔ پہلو میں پائیں باغ تھا جہاں ہماری جاگتی ہوئی زندگی کا بیشتر حصہ گذرتا تھا۔ کوٹھریوں کی قطار کے بعد ایک بہت بڑی سی باولی تھی جس پر پر چلا کرتا تھا۔ پچھواڑے بھٹوں کے کھیت تھے۔ دوسری طرف ایک سفید مسجد تھی اور دور تک ہار سنگھار' بیلا' چنبیلی اور موگرے کے پیڑ چلے گئے تھے۔ مسجد سے ذرا ہٹ کے قبرستان تھا اور نہر کے کنارے خربوزوں کے کھیتوں کے بعد مرگھٹ تھا۔ ہمیں ان دو مقامات سے بے حد ڈر لگتا تھا۔ یہ پُراسرار آواز اسی طرف سے آتی تھی' اور اس طرف سے آنے والی ہر شے خطرناک لگتی تھی۔

جب شرارت کرتے' اودھم مچاتے تو اسی آواز سے ڈرایا جاتا۔

"ڈائن ہے' کچا چبا جائے گی' بدروح ہے' اکیلے دکیلے پکڑ لیا تو ٹونا کر دے گی۔ سنا ہے گھاگھرا ندی میں کوئی بارات ڈوب گئی تھی۔ دلہن بھتنی بن کر ترائی میں بھٹک رہی ہے۔

اس آواز میں ایک اور خاصیت تھی کہ جب بھی یہ آواز سنائی دیتی تو قدسیہ خالہ پر دل کا دورہ پڑ جاتا۔ دانتی بھینچ کر منہ سے پھین نکلنے لگتا اور گھر ماتم کدہ بن جاتا۔

"یا قوی قادر---- قدسیہ کے دولہا کو کرو حاضر"۔ نانی بیوی جھوم جھوم کر گڑگڑائیں۔ مگر قوی قادر تو ایسے کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے تھے کہ کسی کی سنتے ہی نہ تھے۔ قدسیہ خالہ کے دولہا کو حاضر کرنے کے بارے میں کچھ غور فرما رہے تھے۔

ان کی شادی کو دس برس ہونے کو آئے تھے۔ شادی کے بعد دولہا کو فوراً ہی نانا جان نے ولایت بھیج دیا تھا کہ یہی شرط شادی تھی۔

وہاں سے وہ اس زمانے کے دستور کے مطابق ایک عدد میم لٹکا لائے اور مین پوری میں پریکٹس کرتے تھے۔ اسی لئے قدسیہ خالہ وظیفے پڑھتیں' چلے کھینچتیں اور جب وہ ناکام ثابت ہوتے تو دانتی بھینچ کے دورے ڈال لیتیں اور غریب کیا کر سکتی تھیں۔ انہوں نے "سرتاج من سلامت" کے نام درجنوں خط بھیجے۔

"مجھے میم صاحب کی آیا سمجھ کر ہی ایک کونے ڈال لیجئے۔ آپ دونوں کی خدمت کروں گی۔ جھوٹن کھاؤں گی۔ اترن پہنوں گی اور منہ سے اف کر جاؤں تو جو چور کی سزا سو میری۔ آپ مالک ہیں میں آپکی لونڈی میرے لئے اس سے بڑھ کر کیا خوش نصیبی ہو گی کہ آپ کے قدموں میں دم نکلے"۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ مگر سرتاج نے تو جواب دینا بھی حماقت سمجھا۔

عام طور پر قدسیہ خالہ کا لوگوں سے یہی کہہ کر تعارف کرایا جاتا تھا کہ "بھئی یہ ہیں قدسیہ جن کے میاں نے میم ڈال لی ہے"۔ لوگ خاصے مرعوب ہو جاتے تھے۔ اس وقت قدسیہ خالہ بھی اپنی نامرادی بھول کر فخر کرنے لگتی تھیں۔ ان کی سوت حاکموں کی بیٹی تھی کیا عجب بادشاہ سلامت سے دور دراز کا ناطہ بھی ہو۔ ہر کوئی میم تھوڑی ڈال سکتا ہے۔ ایک طرح سے میاں نے میم سوتن لا کر ان کی عزت افزائی کی تھی۔ کوئی دھوبن یا چمارن بھی ڈال سکتے تھے۔

قدسیہ خالہ کی پندرہ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ چھٹے مہینے میاں ولایت کو سدھار گئے۔ دو سال تک تو دیوانگی سے عشق چلتا رہا۔ ہر وقت سر اوندھائے یا میاں کو خط لکھا کرتیں یا آیا ہوا خط پڑھا کرتیں۔ پھر خط پھیکے پڑنے شروع ہوئے۔ پھر ٹھنڈے پڑ گئے۔ یہ خط لکھ لکھ کے دیوانی ہو گئیں۔ وہاں سے جواب ندارد! پھر بری بری سناونیاں آنے لگیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد میموں کا بھاؤ گر گیا تھا۔ اس لئے جو ولایت جاتا بہتی گنگا سے مچھلی مار لاتا۔ مگر قدسیہ خالہ کے میاں نرالے تھے اور بھی لوگ میمیں لا رہے تھے۔ چھٹے چھ ماہے ہندوستانی بیوی کو صورت تو دکھا جاتے تھے۔ انہوں نے تو ایسی چپ سادھی کہ الٹ کے خبر ہی نہ لی۔

جب ہی تو عرس پر قوالی ہوتی تو قدسیہ خالہ کو دورہ پڑ جاتا آس پاس کہیں شادی

ہوتی۔ ان کی دانتی بھنچ جاتی۔ کوئی دور کہیں رات کے سناٹے میں برہا گاتا۔ ان کے منہ میں پھین آ جاتے۔ خاص طور پر یہ پراسرار آواز جب بھی انہیں سنائی دیتی۔ بیکل ہو کر ٹہلنے لگتیں۔ انگلیاں چٹخاتیں۔ آنچل مروڑتیں اور دورہ ڈال لیتیں۔

ہم کلیاں چن رہے تھے۔ جھولیاں چھلک رہی تھیں۔ مگر ہمیں صدر دروازے کے چوکور قندیل کے روشن ہونے کا انتظار تھا کہ یکایک وہ آواز بالکل ہماری پشت پر لہرائی۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہم نے چونک کر دیکھا وہ مسجد کے پچھواڑے پرانے قبرستان میں ٹوٹی پھوٹی قبروں کے درمیان آندھی' میں گرے ہوئے ایک برگد کے درخت کے تنے پر کچھ روٹھی سی بیٹھی تھی۔ وہ گاتے گاتے رک گئی ہمارے پیر بھوسا بھری بوریوں کی طرح دھننے لگے۔

"چھوڑو ہمرا آنچل!" وہ اپنی پشت کی طرف مڑ کر کسی کو ڈانٹ رہی تھی۔

ہم گرتے پڑتے بسورتے بھاگے۔

اس کا آنچل کوئی نہیں پکڑے تھا وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ ایک دم تنک کر کھڑی ہو گئی۔ اور آنچل جھٹک کر ہنستی ہوئی تیز تیز بھاگی۔ جیسے کوئی شریر اسے پکڑنے دوڑ رہا ہو۔ تیز تیز چلتی وہ پیڑوں میں گم ہو گئی۔

تب ہماری گھگی بندھی اور پیروں کا بھوسہ بکھرنے لگا۔

"میرٹھ میں ملیں گے دونوں جنے"۔ دور اس کی آواز نے لہرا لیا اور ہم غڑاپ سے پردہ پار

"تم سیاں کالے' ہم گورے"

"آئینہ میں دیکھیں گے دونوں جنے"۔ اس کی آواز پھرکی کی طرح تھرکنے لگی اور ہماری پیٹھ پر موتی پرونے کی سوئیاں سی چلنے لگیں۔

"تم سیاں موٹے ہم دبلے"۔

"کانٹے میں تلیں گے دونوں جنے"۔

کیسے اتفاق کی بات تھی۔ قدسیہ خالہ کے دولہا کالے بھی تھے اور موٹے بھی مگر میرٹھ میں ملنے کے کوئی آثار نہ تھے! پھر وہ دورہ نہ ڈالتیں تو کیا کرتیں۔

نانی بیوی کو تو فرصت نہ تھی۔ دادی اماں ابھی تسبیح پر بدبدا رہی تھیں۔ ان کی

دادی بی نے "چھو" کی تب بھی خوف دور نہ ہوا۔ اف کتنی دادیاں" نانیاں' خالائیں' پھوپھیاں' بھری پڑی تھیں مگر کوڑی کام کی نہیں۔ "چھو" تک میں دم نہیں۔

"او کے منہ نہ لگا کرو بیٹا۔" مجاور نے جب ہم جمعرات کو درگاہ پر پھول چڑھانے جاتے تھے تو کہا تھا۔

"بڑی کھتر ناک عورت ہے"۔

"کیوں"

"بڑی منحوس ہے مائی باپ کسم سب کا کھائے گی"۔

"کھا گئی"۔ ہم سمجھے سچ مچ نمک مرچ چھڑک کر کھا گئی۔

"اکیلے ماں پائے گی تو تمرا جیو نکال کے کھائے جیسے"۔ کم بخت نے اور ڈرایا۔

"کیا ڈائن ہے"۔

"اور کیا؟"

"لاحول ولا قوہ۔۔۔ کیا بکواس ہے۔ نہیں بچو بیچاری پاگل ہے"۔ شاہ صاحب نے مجاور کو ڈانٹا۔

"پاگل؟" شاہ صاحب کی بات ہمیں پسند نہیں آئی۔ سارا رومان ختم ہو گیا۔ صرف پاگل ہے اور وہ بھی مزیدار پاگل نہیں۔ نہ اس میں سے بدبو آتی ہے۔ نہ کپڑے پھاڑتی ہے۔ نہ اینٹے مارتی ہے۔ بس جب دیکھو گا رہی ہے۔

"سیاں توری گوری پھول گیندا بن جاؤں گی"۔

"بلماں توری گودی"۔

آواز بڑی میٹھی تھی جبھی تو قدسیہ خالہ تڑپا کرتی تھیں۔

"اچھی بی اماں گوڑی کو بلوائیے نا' ذرا گانا سنیں گے"۔

"نا بچی موئی پاگل کو کیا بلاؤ گی۔ اچھے بھلے گھر کی لڑکی' پردہ ورہ کو آگ لگا کر ہنڈو ہنڈو پھرے ہے سنا ہے اس پر سایہ ہے۔ ساری بارات گھاگرا ندی میں ڈوب گئی۔ یہ تڑپتی رہی تین دن تک۔ جانو کسی نے تلے ہتھیلی لگا دی ہو۔

"پر دکھیا گاتی اچھا ہے"۔ قدسیہ خالہ کو گانا سننے کا جنون تھا۔ جب شبیر ماموں نعتیں پڑھتے تو ان کی آنکھوں سے ندی نالے بہہ نکلتے۔

"تم پہ قربان میری جان "رسول عربی"۔ وہ گاتے اور قدسیہ خالہ آنچل میں ناک دبائے سسکیاں بھر بھر کے جھومتیں۔ سب تنے بیٹھے رہتے اور اس دورے کے پڑنے کا انتظار کرتے۔ جو شبیر ماموں کے آنے اور نعتیں پڑھنے پر ضرور پڑ جاتا۔ خالہ کے ہاتھ ٹیڑھے ہو جاتے آنکھیں نخور لیتیں' اور منہ سے جھاگ ابلنے لگتے۔ نانی دادی دوڑ کر ان پر آیتیں پڑھ پڑھ کر دم کرتیں۔ شبیر ماموں دور چوکی پر بیٹھے اپنے ہاتھوں کی لرزش چھپایا کرتے اور جب تک انہیں چین نہ آ جاتا بے قرار صدر دروازہ کے پاس ٹہلے جاتے۔

شبیر ماموں قدسیہ خالہ کے رشتہ میں دیور ہوتے تھے۔ غریب والدین کے نہایت مسکین پھس پھسے اور مرگھلے سے اکلوتے بیٹے تھے اور بہن بھائی پیدا نہ ہو کر زیادہ مزے میں رہے۔ ورنہ ہمارے ان ہی جیسے پھس پھسے اور مرگھلے بہت سے ماموں ہوتے۔ بڑے ہی دبلے پتلے اور قدسیہ خالہ سے کوئی گز بھر اونچے تھے۔ بالکل اونٹ کی طرح کمر نکال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلتے تھے۔

"شبیر بھائی کچھ سنایئے"۔ قدسیہ خالہ ان کے آنے پر غمناک آواز میں فرمائش کرتیں"۔ سنایئے ناذری بی ٹھہرے گا"۔

"کیا سناؤں' آج گلا خراب ہے"۔ وہ ہمیشہ ایک ہی عذر پیش کرتے۔ پھر ذرا گلا صاف کرتے' آنکھیں بچھاتے' نتھنے پھلاتے دونوں ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے درمیان لٹکا لیتے اور۔۔۔۔

"سن اے با۔ دصبا تو جا۔ نب طیبہ اگر گذرے تو جا کر تھامنا۔ باب حریم پاک کے پردے" بڑی صاف نتھری ہوئی نرم آواز میں وہ گاتے۔ اس وقت ان پر بہت ترس آتا۔ باد صبا کم بخت بھی کانوں میں تیل ڈالے بیٹھی تھی۔ نہ ان کی سنتی تھی نہ جانب طیبہ جاتی تھی۔

سب کو معلوم تھا کہ شبیر ماموں کو قدسیہ خالہ سے انس تھا۔ مگر کیا مرگھلا اونگھتا ہوا عشق تھا گھر کی اور سیانی لڑکیوں لڑکوں کا بھی عشق تھا کیا دندناتا زقندیں مارتا۔ جب دیکھو دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔ کونوں کھتروں میں دبوچا جا رہا ہے۔ اکیلا پایا اور

بھبوڑ ڈالا۔ تاش کے بہانے چھین جھپٹ۔ پچیسی کی کوڑیاں چھینی جا رہی ہیں۔ گھر کے بڑے بوڑھے ڈانٹ رہے ہیں۔ جنم میں تھوک رہے ہیں۔ مگر چکنے گھڑے کھی کھی ہنسے جا رہے ہیں۔

مگر شبیر ماموں تو پاس لگ کے بھی نہ بیٹھے کبھی چھوٹی انگلی بھی نہ چھوائی۔ وہ شجر ممنوعہ جو تھیں کسی اور کی امانت جو انہیں رکھ کے بھول چکا تھا پچیسواں ختم ہو کر چھبیسواں سال لگا تھا کہ مانگ میں پکے بال چمکنے لگے۔ سب ہی چاہتے تھے جلدی سے وہ بوڑھی ہو جائیں کہ قصہ ختم ہو۔

"نا بھائی ہم اوپکلیا کا ناہیں بلائے جاویں گے"۔ دانہ دلنے والی شراندی پٹھانی بوا سے قدسیہ خالہ نے خوشامد کی تو ٹکا سا جواب دیا"۔ کسم کھائی ڈھیلا مارت ہے"۔

بھئی کمال ہے اسے مردوئے چھیڑتے نہیں کوئی اور سری کی ہوتی تو ٹکا بوٹی ہو جاتی۔ نامرادنی ٹھنی سولہ سنگار کئے رات برات جنگلوں میں گھومتی ہے۔ ڈر نہیں لگتا۔"۔ چچی بی نے پوچھا۔

ارے او کا کاہے کا ڈر ہے بھال کوڈکی او کی طرپھ ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے"۔ پٹھانی بولیں۔

"کیوں' کیا شیرنی ہے۔ پھاڑ کھائے گی؟"

اکیلی دکیلی گھومتی ہے"۔

"اکیلی ناہیں گھومت ہے۔ او کے میاں جو سنگ ہوت ہیں"۔

"میاں کون؟"

"بالے میاں۔۔۔"

"لو اور سنو! اے چل ہٹ دیوانی"۔

"چل ہٹ کا؟ کسم سے میاں کی پیاری ہے۔ اپنے گاجی میاں کی بندنی ہے"۔

پٹھانی بوا نے تفصیل سے بتایا کہ وہ غازی میاں کی محبوبہ ہے۔ حالانکہ غازی میاں کو جام شہادت پئے چار سو سال سے اوپر ہو چکے ہیں۔ عشق صدیوں کے ہیر پھیر کا قائل نہیں۔

غازی میاں کے مزار پر ہر سال عرس ہوتا' دور دور سے قوال اور گویئے

آتے۔ ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگ' بوڑھے' جوان بچے' عورت' مرد زیارت کے لئے حاضر ہوتے۔ منتیں مانی جاتیں۔ مرادیں پوری ہوتیں۔

ہر جمعرات کو شہر کی اور آس پاس کی قصبوں کی طوائفیں نذرانہ لے کر آتیں۔ میاں کی شان میں غزلیں' ٹھمریاں' دادرے گاتیں۔ جب کسی نوچی کی نتھنی اتاری جاتی تو پہلے وہ میاں کے مزار پر حاضر ہو کر مجرا گزارتی۔ مئی جون کی شعلہ بار گرمیوں میں میلہ لگتا۔ عقیدت مند مہینوں پہلے سے آکر پڑاؤ ڈال دیتے عین میلے کے دنوں میں اتنی خلقت جمع ہوتی کہ آس پاس کئی میل تک تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی درگاہ کے بلند دروازے کے آگے دل بادل تانا جاتا زائرین آتے۔ پھولوں کا دونا مٹھائی اور پیسے شامیانے پر اچھال دیتے۔

مختلف گاؤں اور قصبوں سے جھنڈے آتے ساٹھ ساٹھ فٹ کے بانسوں کے سرے پر سیاہ یا سفید بالوں کا گچھا آویزاں ہوتا اس کے نیچے پچاس کا پھریرا لہراتا ہوتا۔ جس کی منت پوری ہوتی وہ مزار پر جھنڈا چڑھاتا۔ ڈھول تاشے بجاتے' کودتے اچھلتے درگاہ کے سامنے پہنچ کر ایک حلقہ بنا لیتے بیچ میں ایک مضبوط سا آدمی جھنڈا لئے ہوتا۔

سہارے کے لئے اس کے سرے پر رسیاں باندھ کر چار آدمی تانے رہتے کہ جھنڈا سرنگوں نہ ہو جائے پھر وہ پہلوان اس جھنڈے کو اونچا اٹھا کر رقص کرتا عجیب عجیب کرتب دکھاتا۔ کبھی جھنڈا ماتھے پر سادھ کر تھرکتا۔ کبھی دانتوں پر رکھ کے جھومتا۔ جب سب پسینہ پسینہ ہو جاتے یا شاید وقت ختم ہو جاتا' کیونکہ دوسرے جھنڈوں کے جلوس منتظر کھڑے' ہوتے کہ ایک جھنڈے کا ناچ ختم ہو تو دوسرے کو موقع ملے۔ پھر تھکے ہارے جھنڈے کو جہاز کے مستول کی طرح پھریرے میں لپیٹ کر کندھوں پر رکھ کر بلند دروازہ سے اندر لے جایا جاتا۔ اور دوسرے جھنڈے کا ناچ شروع ہو جاتا۔ میلے کے خاتمہ پر جھنڈے نیلام کر دیئے جاتے تھے۔

ہماری اماں ہر سال یہ جھنڈے خرید کر انہیں چوکیوں پر جازموں کی طرح استعمال کیا کرتی تھیں۔ یہ جازم سوزن کاری کا لاجواب نمونہ ہوا کرتی تھیں۔ کھدر پر مختلف رنگوں کے کپڑوں کی کترنوں سے ہاتھی گھوڑے بنے ہوتے تھے۔ کہیں فوجیں' نیزے اٹھائے جا رہی ہیں۔ کہیں اونٹ سواروں کی قطاریں' کہیں بھیڑ

بکریوں اور گایوں کے ریوڑ' کہیں راز و نیاز میں مصروف عورت مرد' ہم گھنٹوں چوکیوں پر لوٹ لوٹ کر نظارے کرتے۔ مگر جی نہ بھرتا۔ جھنڈوں کے علاوہ جس کی بھی منت پوری ہو جاتی وہ خوش نصیب سونے چاندی کے پتلے' میز کرسی مسہریاں اور برتن حسب وعدہ چڑھاتا۔

پھر غازی میاں کی شادی کی رسمیں شروع ہو جاتیں۔ بلند دروازے پر نوبت رکھی جاتی۔ بڑی ہی اکتا دینے والی تال میں صبح تڑکے سے بجنا شروع ہو جاتی۔ اور رات گئے تک بجا کرتی گروہ کے گروہ آکر نوبت بجانے والوں کو گھیر لیتے۔ پھر وہ چار منچلے کانوں پر ہاتھ رکھ کر برہا گانے لگتے۔ ایک گروہ شل ہو جاتا تو دوسرا اس کی جگہ آ جاتا۔ آسیب زدہ عورتیں میاں کی چوکھٹ پر بھوت اتروانے جاتیں۔ بال کھول کر سر دھنتیں۔ جب منتر پڑھنے والے دھونی دیتے۔ تو چیخیں مار کر بے ہوش ہو جاتیں۔ پھر ہوش میں آکر جھومنے لگتیں۔ زبردست قسم کا بھوت ہوتا تو کئی کئی دن ہو جاتے ڈٹا رہتا۔ لال ہرے ڈنڈوں سے بھوت کی خبر لی جاتی۔ تب بڑی مشکل سے جان چھوڑتا۔ پھر صحت پانے والی درگاہ پر چڑھاوا چڑھاتی اور خوشی خوشی رخصت ہو جاتی۔

پانچ تاریخ کو پنکھا اٹھتا۔ پھر سات کو صندل' اور نو کو مہندی۔ اسی شب کو غازی میاں کا کرتا جس پر کلام مجید لکھا ہوا تھا۔ زیارت کے لئے کھولا جاتا۔ خلقت ٹوٹ پڑتی۔ گیارہ تاریخ کو بارات چڑھتی۔

رادھا بھائی عرف زہرہ بی بی ردولی کی بال ودھوا میاں کو دل دے بیٹھی۔ غازی میاں نے اسے خواب میں بشارت دی اور سوئیکار کر لیا وہ مزار پر دھونی رما کر بیٹھ گئی۔ روز اپنے آنسوؤں سے مزار کو اشنان کراتی اور بالوں سے فرش جھاڑتی۔ اس کا باپ تیلی تھا وہ اسے زبردستی گھسیٹ لایا' مگر رادھا اپنی ضد پر اڑ گئی۔ رادھا نام کی سب ہی لڑکیاں بڑی ضدی ہوتی ہیں۔ بیانگ دہل اپنے عشق کا اعلان کرتی ہیں۔ ساری ذلتیں اور بدنامیاں ہنس کے جھیلتی ہیں تن من دھن کی بازی لگا دیتی ہیں اور پانسہ ان کے حق میں ہی پڑتا ہے۔ مخالف ہوائیں ان کے جذبہ عشق کے آگے سر جھکا دیتی ہیں۔ پھر لوگ ان کے اس جذبہ کی پوجا کرتے ہیں ان کی شان میں گیت گاتے ہیں۔ اور انہیں دیوی کا استھان بخشتے ہیں۔

غازی میاں کی رادھا کو بھی انگاروں پر چلنا پڑا۔ اور کانٹوں میں گھسٹنا پڑا۔ اس کی ماں نے اسے چار چوٹ کی مار دی۔ باپ نے بھیگی رسی سے اس کی کھال ادھیڑ دی اور بھینس کے کھونٹے سے باندھ دیا۔ اور سارے گاؤں نے اس کے منہ پر تھوکا۔ آدھی رات کو جب بھوکی پیاسی رادھا زخموں سے چور گوبر میں لت پت پڑی دم توڑ رہی تھی تو غازی میاں نے اپنے آنسوؤں سے اس کے زخم دھوئے اسے اپنی مقدس چھاتی سے لگا لیا۔ اور اپنے خون جگر میں شہادت کی انگلی ڈبو کر اس کی مانگ بھر دی۔

جب متوالی میرا نے اپنے گرد ہر گوپال سے پیار کیا تو دنیا نے اس کی زندگی میں ناگ چھوڑ دیئے۔ اور زہر کا پیالہ دیا۔ پھر....... کرشن مراری کی مرلی جاگ اٹھی اور .... ناگ .... پھولوں کی مالا بن گیا ...... زہر کا پیالہ امرت سے چھلک پڑا ......

صبح سویرے ردولی والوں کی آنکھ کھلی تو مندروں میں گھنٹے بج رہے تھے۔ اور مسجد کے برج سے اذان گونج رہی تھی۔ رادھا چندن میں بسی شاہانہ جوڑا پہنے پھولوں کی سیج پر ابدی نیند سو رہی تھی۔ جسم پر ایک خراش کا نشان بھی نہ تھا۔ کندن کی طرح شریر جگمگا رہا تھا۔ مانگ میں سیندور مسکرا رہا تھا۔

ردولی والوں کی جان نکل گئی۔ پنچایت بیٹھی اور فیصلہ ہوا کہ بیٹی پرائے گھر کی ہو چکی ہے۔ اب میکے میں اس کا کیا کام۔ لہٰذا دلہن کو سسرال پہنچا دیا گیا۔

ہندو اسے رادھا کہتے ہیں اور مسلمان زہرہ بی بی مزار کے قدموں میں اس کی سادہ قبر تھی۔ پائینتی ذیلی کا ایک جنا دری پیڑ ہوا کرتا تھا۔ جس کی چھال جلانے سے صندل کی خوشبو آتی تھی۔

ہر سال ردولی والے غازی میاں کی بارات لے کر آتے ہیں۔ سر شام ہی سے بچوں کو سلا دیا جاتا تھا۔ کہ رات کو تین بجے بارات پہنچے۔ تو جگا دیا جائے۔ جونہی جانی پہچانی شہنائیوں کی آواز سنائی دیتی۔ سب کو جگا دیا جاتا۔ منہ پر جلدی جلدی پانی کے چھپکے مار کے سوئی سوئی آنکھوں سے بارات دیکھنے کوٹھے پر چڑھ جاتے۔

کتنے سال ہو گئے مگر آنکھوں میں اب تک وہ بارات بجی ہوئی ہے۔ آگے آگے سفید گھوڑا۔ سونے چاندی کے زیوارت میں غرق پھولوں سے ڈھکا ہوا۔

سہرے کی لڑیاں گھوڑے کے سموں کو چومتیں۔

"وہ دیکھو وہ بالے میاں"۔ ہمیں واقعی وہ گھوڑے پر بیٹھے نظر آنے لگتے۔ اس کے پیچھے سرخ شبنم کے پردے پڑی پالکی' جس کے وسط میں کلام مجید رکھا ہوتا اور ایک شمع روشن ہوتی۔

"دلہن دلہن"۔ ہم مسحور ہو جاتے۔ شمع کی تھر تھراتی ہوئی لو سرخ شبنمی پردوں کے پیچھے سے بالکل شرمائی لجائی دلہن کی طرح لگتی تھی۔ دلہن کے بعد براتی ہاتھوں میں روپہلی سنہری موتیوں کی جھالریں لگی چھوٹی چھوٹی چھتریاں جن پر سلمہ ستارے کا کام کیا ہوتا تھا۔ پھرکیوں کی طرح گھماتے' جھومتے' ناچتے جوق در جوق اڈتے چلے آتے ... آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ کئی کئی دن تک پتلیوں میں چھتریاں ناچتی رہتیں۔

کبھی کوئی بہت ہی خوبصورت چیز دیکھو تو جی بھر آتا ہے قدسیہ خالہ کا جی تو ہر دم بھرا ہی رہتا تھا۔ بس چھلکنے۔ کے لئے بہانہ کی ضرورت ہوتی۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر سر رکھے وہ لمبے لمبے آنسو بہائے جاتیں۔ بارات کو دیکھ کر ان کا کلیجہ کٹنے لگتا تھا۔ سب ہی اداس ہو جاتے تھے۔ یہ بارات تھی یا جنازہ! ایک ننھی سی کمزور لڑکی پر زندگی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے خوابوں کی دنیا بنا کر ایک چھوٹی سی جھری کھولنا چاہتی۔ مگر نا سمجھ انسان اجازت نہیں دیتے۔ کیونکہ وہ ان کے یقین میں رخنے ڈالنا چاہتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے کہ ان کا سارا یقین چکنا چور کر کے منہ موڑ لیتی۔

مگر شبیر ماموں نہ تو کنہیا جی تھے۔ نہ غازی میاں' وہ تو نہایت ادھورے اور کھوکھلے انسان تھے۔ وہ قدسیہ خالہ کی زندگی میں پھنکارتے ناگوں کو اپنی بانسری سے پھولوں کی مالا نہیں بنا سکتے نہ ان کی روح پر لتھڑے ہوئے گوبر کو اپنے یقین کے بل بوتے پر چندن بنا سکتے تھے۔ ان کی دولت تو دو لرزتے ہوئے ہاتھ تھے۔ جن سے وہ مچلتی ہوئی آرزوؤں کا گلا گھونٹنا خوب جانتے تھے۔ اور قدسیہ خالہ چھبیس برس کی عمر میں بھولی ہوئی بلت بنی سسک رہی تھیں۔ ان میں اتنی ہمت بھی تو نہ تھی کہ بوا کی طرح پاگل ہی ہو جاتیں۔ ان سے بھی لوگ ڈرنے لگتے ان کے غازی میاں پر تو سب ترس کھاتے تھے اور مذاق اڑاتے تھے۔ بہت سے مردے زندہ لوگوں سے زیادہ

جی دار ہوتے ہیں۔

بوا قدسیہ خالہ سے کچھ ہی بڑی ہوں گی۔ عورت کے دل میں کم سنی ہی سے ہزاروں خوف بھر دیئے جاتے ہیں۔ جوانی کو وہ ایک کچی ٹھلیا سمجھنے لگتی ہے۔ جسے قدم قدم پر کنکریوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ بوا کی دیوانگی نے دل سے اور جنت سے خدشوں کے ساتھ عزت آبرو لٹنے کا خوف بھی خرد برد کر دیا تھا۔ کچی ٹھلیا کے بجائے وہ ٹھوس گولا لڑھکاتی تھیں۔ مردانہ وار اندھیرے اجالے جہاں جی چاہتا چلی جاتیں۔ کچھ ایسی وحشت بٹھا دی کہ لوگ مان گئے نہ جانے کس طرح دو چار معجزے ہو گئے۔ جو یقین بن گئے۔ ایک دفعہ کسی بدمعاش نے انہیں اکیلا پا کر دبوچنا چاہا۔ غازی میاں نے اس زور کا لپٹر رسید کیا کہ اس کا تھوبڑا وہیں کا وہیں ٹیڑھا ہو گیا۔ ایک اور کم نصیب الجھا تھا۔ سنتے ہیں جس ہاتھ سے اس نے ان کی کلائی پکڑی تھی وہ سڑ گل کر گیا۔

چچا میاں تو مرتد تھے ہی۔ کہا کرتے تھے۔ درگاہ میں ہر سال ہزاروں کوڑھی شفا کی آس لگا کر آتے ہیں۔ ہاتھ پیر سڑ گل کر گر جانا معجزہ نہیں بیماری ہے۔ اور شرابی کو لقوہ مار جانا بھی ایسی کوئی غیر معمولی بات نہیں"۔ مگر ہمیں تو بوا پر شک کرتے ڈر لگتا تھا کہ کہیں تھوبڑا وہیں کا وہیں ٹیڑھا ہو گیا تو کیا کر لیں گے۔ بڑی جناتی طبیعت پائی تھی۔ پر جب سے معلوم ہوا تھا ذرا سی پاگل ہیں بھٹنی وتنی نہیں۔ تو ہمیں ان سے ڈر بھی نہیں لگتا تھا۔

ایک دن برگد کے پیڑ کے نیچے کھڑی سلیپر اتار کر مٹی جھاڑ رہی تھیں۔ ہم نے قدسیہ خالہ کا پیغام انہیں پہنچا دیا۔

"نہ آئیں گے"۔ بڑی رکھائی سے بولیں۔ "جب ہمرا جی کرہے۔ آئے جاویں گے"۔

اور پلیا سے گزر کر جو پگڈنڈی جاتی تھی۔ ادھر ہولیں۔

پھر خدا خدا کر کے ایک دن ان کا جی کرا۔ اور وہ کھٹ سے آ گئیں۔ نہایت بے تکلفی سے بغیر کسی سے بولے چالے پانی پینے کے مٹکوں کے پاس گئیں ایک کٹورا پانی پیا۔ تھوڑی سا آنچل میں بندھی بیلے کی کلیوں پر چھڑکا۔ پھر آنچل سر پر دھر لیا۔ اور بالکل باہر والیوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کر مسکرانے لگیں۔ اماں ہمیشہ

کہتی تھیں کہ شریف زادیاں کولھے پر ہاتھ رکھ کے نہیں کھڑی ہوتیں ایسے باہر والیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ ایک ایسی بھی عمر ہوتی ہے' جب ہاتھ وبال جان ہوتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا انہیں کہاں رکھا جائے تو اس خوف سے کہ باہر والی کہیں نہ بن جائیں سر پر ہاتھوں کی پالتی مار کر رکھ لیتے۔

"اے ہے نگوڑی سر کیوں پیٹ رہی ہو"۔ تب اماں برا مانتیں۔

"پھر کہاں رکھیں؟" ہم عاجز آ جاتے۔

"چولہے میں"۔ وہ اور جل جاتیں۔ "غارت ہو یہاں سے"۔ اور ہم وہاں سے غارت ہو جاتے۔

بوا ایک دم آپ ہی آپ ہنسی۔ پھر چوکی پر بیٹھ کر تنگ پاجامہ کی چوڑیاں سنوارنے لگیں۔ ان کے کپڑے بہت اجلے لگ رہے تھے۔ گلابی دوپٹہ کلف دے کر مروڑا ہوا کندھوں پر پڑا تھا۔ بیلے کی کلیوں کا گچھا آنچل میں بندھا کنپٹی پر جھول رہا تھا۔

انہیں گھورتے دیکھ کر قدسیہ خالہ نے کھٹ سے آنکھیں جھکا لیں اور بیکار ہی تن ڈھکنے لگیں۔

دھنا روئے روئے انکھیاں لال گال

وہ قدسیہ خالہ کو جیسے چڑا کر گا رہی تھیں۔

پان پچاسی کے بیڑا لگائے
بھرے نخور پیا اجھو نہ آئے
دھنا روئے روئے ---- انکھیاں

قدسیہ خالہ تو چلو میں آنسو لئے بیٹھی رہتی تھیں۔ بس چھڑکنے لگیں۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ دورہ ڈال پاتیں۔ بوا تڑک کے باغ والے دروازے سے غائب۔

"چن چن کلیاں سیجیں بچھائیں"۔

دور ان کی آواز لہرائی۔

دھنا روئے روئے انکھیاں ------ لال گال

سب پر رعب طاری ہو گیا۔ بوا غیب دان ہیں قدسیہ خالہ کو چٹ سے پکڑ لیا۔

"کہیں سن چکی ہو گی"۔ چچا بولے۔ دہریئے تھے نا۔ مگر ان کی بات کا کسی نے یقین نہ کیا۔ اس کے بعد وہ آنے جانے لگیں۔ آتیں، بیٹھتیں، جی گھبراتا اٹھ کر چل دیتیں۔

"اے بیٹھو نا بوا...."

قدسیہ خالہ خوشامد کرتیں۔

"ناہیں بھائی ہمکا جائے کا پڑی ہری بات دیکھت ہوئے" اور ہم سمجھے واقعی غازی میاں کدم کی چھیاں تلے کھڑے ان کی راہ دیکھ رہے ہونگے۔

"اچھی بھلی شریف گھرانے کی ہے۔ نگوڑی کی مت ماری گئی"۔

"نہیں بی مجھے پاگل تو نہیں لگے ہے"۔

اوئی تو کیا ڈھیلے مارے جب ہی مانو گی کہ پاگل ہے۔ گھر میں چریا کو گھسا رکھا ہے۔ موئی کوڑی کی دیوال نہیں۔ جس کا جی چاہے دکھیا کو لوٹ لے، خبر بھی نہ ہوَ گی"۔

"اے بی اس کا ذکر نہ کرو میرے جی میں وہم آتا ہے" نانی اماں بولیں۔

"تو کیا میں اس کے برے کو کہتی ہوں"۔

"اس کے اچھے برے کا کیا ٹھیک"۔ مولوی صاحب نے بھی اس کے بھلے کو ہی کو کہا تھا۔ کہ شرع کر لو یوں ماری ماری پھرتی ہو۔ یہ ان کی جان کو آگئیں کہ اپنی اماں کا نکاح پڑھا دو کسی راہ چلتے سے"۔

"بغیر مرد کے عورت کی زندگی محفوظ نہیں ہوتی"۔ مولوی صاحب نے سمجھایا۔

"ہمرا مرد موجود ہے۔ تمرے باپ کا باپ۔ سن پیہیے تو تمری ڈاڑھی ماں آگی لگائی دیہیے"۔

غازی میاں کی پیاری کو کوئی کچھ کہے اور وہ چپ چاپ سن لیں۔ ملا جی کا جوان بیٹا باؤلی سے ڈول بھر کے مڑ رہا تھا کہ سانپ نے ڈس لیا۔ ملانی نے بوا کے تلوے چاٹے، جوتی پر ناک رگڑی تو لڑکے کی جان بچی۔

"پانی کا سانپ ہو گا۔ زہریلا نہیں ہوتا"۔ چچا میاں کا کہنا تھا۔ مگر کون سنتا ہے۔ اپنے ایمان کے آگے؟ ۔ لوگ بوا سے اور بھی ڈرنے لگے۔ ایسی ویسی نہ

تھیں۔ "میاں کی چہیتی محبوبہ تھیں! غازی میاں جو بانجھ کی گود میں پھول کھلاتے۔ کوڑھی کا کوڑھ مٹاتے۔ ایک پل میں فقیروں کو شاہ اور شاہوں کو کنگال بنا دیتے۔ کیا اپنی لاڈلی کا اتنا مان نہ کرتے ہوں گے۔

قدسیہ خالہ کو اب بھی امید تھی کہ شاید میم بانجھ ہے چونکہ ابھی تک چوہے کا بچہ تک نہ جن پائی تھی۔

نانی بیوی کے چلوں اور وظیفوں نے اس کی کوکھ پر تالا ڈال رکھا ہے۔ مولا کو دن پھیرتے دن نہیں لگتے۔ میاں کے مزار پر منت بھی مان رکھی تھی کہ خیر سے قدسیہ کے دن پھر گئے اور گود بھری تو چاندی کا پتلا چڑھائیں گی۔

تین سال سے نانی بیوی چاندی کا پالنا میاں کے قدموں میں چڑھا رہی تھیں۔ کہ "یا غازی میاں یہ پالنا بھر دو ادھر قوی قادر سے سفارش جا رہی تھیں کہ قدسیہ کے دولہا کو حاضر کریں۔ مگر چلے وظیفے اور دعائیں کچھ خلط ملط ہو گئیں۔ پالنا بھرا مگر میم کے وَسیلے سے۔ جس دن سوتن کے ہاں بچی پیدا ہونے کی خبر ملی قدسیہ خالہ اور بھی زمین دوز ہو گئیں۔ جیسے ان کی کچی قبر پر سنگ مرمر کا مزار کھڑا کر دیا گیا اب تو روز حشر منکر نکیر کو ان میں جان ڈالتے ہوئے آلکس آئے گی۔

بوا کئی دن سے نہ جانے کہاں غائب تھیں۔ ایک دن سے آن دھمکیں۔ نانی بیوی اس نائن کی خبر لے رہی تھیں جو لڈو دینے آئی تھی۔ نانی نے لڈو موری میں لڑھکا دیئے۔ اور نائن کا چونڈا مونڈنے کی دھمکی دینے لگی۔ وہ نگوڑی بھاگی اپنا لنگا سنبھالتی۔

بوا نے جو بچی کی پیدائش کی خبر سنی تو باؤلوں کی طرح چہکنے لگیں۔

"اے بڑی بٹیا۔ سوتیا کی گود ہری ہوئی گی۔ سٹورا اچھوانی نہ بنٹیو؟" پھر کھونٹی سے ڈھولکی اتار کے اوندھی سیدھی زچہ گیریاں الاپنے لگیں۔

"پیر میں پنجنیاں لالہ چھم چھم کھیلے گا"۔ لالہ تو پیدا ابھی نہیں ہوا تھا۔ چھم چھم خاک کھیلے گا۔ نانی بیوی کو یہ بے وقت کی راگنی کھل گئی وہ ٹانگ لی کہ بوا نے ڈھول ایک طرف لڑھکایا۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی مسجد کے پچھواڑے جا بیٹھیں۔ بوا کئی دن کے لئے اڑن چھو ہو گئیں۔ ان کی یہی عادت تھی۔ دن ہو کہ رات جب دحشت بڑھتی۔ پیدل نکل کھڑی ہوتیں۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں نکل

جاتیں۔ کوئیں کی منڈیر پر گھڑی بھر کو دم لیتیں۔ کوئی نیا گیت سنائی پڑ جاتا۔ تو اسے سمیٹ کر اپنے گیتوں کے خزانے میں جمع کر لیتیں۔ پھر آگے بڑھ جاتیں۔ کئی کئی دن بنا کھائے چلی جاتیں۔ پاگلوں میں بڑا دم ہوتا ہے۔ سوتے ہوئے ہم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ نہ انہیں سانپ بچھو چھیڑتے نہ جنگلی جانور۔ ترائی کے ادھر گاؤں میں شیر لگتا تھا۔ مگر انہیں دیکھ کر راستہ چھوڑ دیتا۔ کچھ لوگ تو کہتے تھے وہ انہیں ماتھا ٹیک کے سلامی دیتا تھا۔

ایسے وثوق سے بوا غازی میاں کی شرارتوں کے قصے سناتیں کہ شک کرنے کی گنجائش نہ رہ جاتی۔

درگاہ کے پاس رہ کر ہر بات یقین آنے لگی ہے۔ میاں بڑے ضدی اور ہٹیلے تھے۔ ہر وقت چھیڑ خانیاں کیا کرتے۔ کبھی آنچل پکڑ کے کھینچ رہے ہیں۔ کبھی چوڑیاں مرکائے دیتے ہیں۔

"اے بی میاں تم پر عاشق کیسے ہو گئے"۔ قدسیہ خالہ پوچھتیں

"دل آئے گوا!" بوا نخرے سے مسکراتیں۔

"یہی تو پوچھتی ہوں دل کیسے آیا"۔ قدسیہ خالہ کو دل لانے کے گر معلوم کرنے کی بڑی فکر رہا کرتی تھی۔ تن من دھن نچھاور کرنے کے بعد بھی انہیں تو کسی کا دل نہ ملا۔

"اب ای ہم کیا بتاویں۔ ان ہی سے پوچھ لو۔ ای کا سامنے کھڑے مسکراوت ہیں"۔

وہ سپاٹ دیوار کی طرف ٹھینگے سے اشارہ کرتیں اور سب ڈر کے ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ ہری ماری آنکھوں کو کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ان کے لئے تو چودہ طبق روشن تھے۔

"ملاقات کیسے ہوئی؟"

"پنیا بھرن جات رہیں۔ ہاٹ روک کے کھڑے ہو گئے"۔

"پھر؟" ہم ان کے پاس کھسک کر پوچھتے۔

"ہم اٹھ کے بھاگیں۔ بس ہماری کلائی پکڑ لیں!"

"پھر؟" ہم اور کھسکتے۔

"ہمرا باپو گسائے گئے؟" وہ کہیں دور خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتیں۔

"کہن ماجھی کا پوت ہے۔ ہم اپنی دھی نہ دیں گے"۔

"ماجھی کا پوت؟"

پھر بوا بتاتیں کہ مادی آنکھوں کے لئے میاں ا ماجھی کے بیٹے کا روپ دھار کے ان کے باپو سے پیر پکڑ کر انہیں مانگنے آئے تھے۔ باپو گسائے گئے اور انہیں دھتکار دیا۔ پھر ان کی شادی کسی دوسری جگہ کر رات جب بارات گھاگرا ندی پار کر رہی تھی۔ زبردست طوفان آیا۔ میاں جو ماجھی بنے اسی نوکا کی پتوار سنبھالے تھے۔ وہی طوفان لائے تھے۔ انہوں نے سب کو چھوڑ کر انہیں بچانے کی کوشش کی۔ مگر براتیوں نے گڑبڑ شروع کر دی..... گسائے کے بالے میاں نے نوکا الٹ کر سب کو ڈبو دیا۔ اور بوا تین دن تک پانی پر دلہن بنی پھولوں کی سیج پر تیرتی رہیں۔

"پھر؟" ہم کھسک کر بالکل ان کی گود میں گھس جاتے۔

"پھر تمرا کھوپڑا"۔ وہ اکتا کر ہمیں دور دھکیل دیتیں اور کھوئی کھوئی آنکھیں لئے قبرستان میں لہربے گاتی سرگراں گھومتیں۔

بوا کنواری تھیں۔ کسی مٹی کے پتلے نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ بارات کے ڈوبنے کے بعد وہ کسی طرح کنارے سے لگ گئیں۔ کئی دن جنگلوں میں سرگرداں پھرتی رہیں۔ جب ان کے والدین کو ان کا پتہ چلا تو دوڑے آئے۔ مگر جب تک بوا اپنے خوابوں کی دنیا میں پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے سہاگ کی چوڑیاں ٹھنڈی کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ سہاگن تھیں' اور بالے میاں ان کے دولہا تھے۔ بالے میاں سے الجھنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

"او ہمکا بلاوت ہیں؟" ان کا جب جی چاہتا نکل کھڑی ہوتیں۔ اور جنگلوں میں عشقیہ لوک گیت گاتی پھرتیں۔ ان کی مرضی کو بالے میاں کی مرضی اور خدا کا حکم سمجھ کر کسی نے چوں نہ کی۔ پھر آہستہ آہستہ ان کے بارے میں معجزے مشہور ہونے لگے۔ تو اور بھی لوگوں کی ان سے کنی دبنے لگی۔ وہ پوجی جانے لگیں۔ لوگ میاں سے سفارش کرانے کے لئے ان کی سیوا کرتے۔ جدھر نکل جاتیں آنکھیں بچھاتے۔ ان کا کام کرنا خوش قسمتی سمجھتے۔ جس کی مراد پوری ہوتی۔ وہ غازی میاں

کے مزار پر چڑھاوا چڑھانے کے ساتھ ان کے لئے بھی گلابی دوپٹہ اور تیل عطر چوڑیاں اور پھول نذر کرتا۔ کھانا وہ کھاتی ہی کتنا تھیں۔ کئی کئی دن بھوکی رہ لیتی تھیں۔ لوگ تھال سجا کر ان کے گھر دے جاتے۔ وہ اٹھا کر فقیروں کو کھلا دیتیں۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد وہ اسی طرح اکیلی رہتی تھیں۔ ایک چمارن گھر کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ دنیا بھر کے کپڑے پھاڑنے اور کھونے والی دھوبن ان کے کپڑے سب سے اجلے دھوتی تھی۔ تھوڑی بہت زمین بھی تھی مگر انہوں نے وصولی کبھی ضروری نہ سمجھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لوگ انہیں غازی میاں کی پیاری ماننے لگے تھے۔ وہ انہیں بھی پیاری تھیں۔ انہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ان پر جان نچھاور کرنے والے بہت تھے۔ اسی لئے وہ ایک کمزور عورت ہوتے ہوئے بھی اپاہج اور مجبور نہیں تھیں۔ مردوں کے تمام حقوق انہیں حاصل تھے۔ ذات برات اکیلی جہاں چاہتیں اونچی آواز سے اعلان عشق کر دیتیں۔ اونچی آواز سے الاپتیں آوازے کستیں۔ دھڑ سے گالی بک دیتیں۔ مردوں کے ساتھ بیٹھ کر قوالی سنتیں۔ اور چھنا چھن روپے پھینکتیں۔ غازی میاں کے سالانہ میلہ کے زمانہ میں لاکھوں زائرین کے ہمراہ۔ ہزاروں لچے بدمعاش بھی آنکلتے۔ آئے دن اغوا اور آبرو ریزی کے واقعات سننے میں آتے۔ بیگمیں بند شکرم میں چپراسیوں کے پہرے میں نکلتے خطرہ محسوس کرتیں۔ اور وہ مزے سے بھیڑ کو چیرتی گلابی آنچل لہراتی پھرتیں۔

"اے ہے بوا زمانہ بڑا خراب ہے۔ میلے میں نہ جاؤ"۔

اماں انہیں ٹوکتیں۔ "اکیلی گھومتی ہو ڈر نہیں لگتا"۔

"کون ہم اکیلے گھومت ہیں؟" ارے ہم اکیلے ناہیں' ہمرا ساتھ او جو رہت ہیں"۔ یعنی ان کے "وہ"۔ "مجال ہے کوئی کی جو ہم سے بولے۔

سب لاجواب ہو جاتے۔ کون الٹی سیدھی بات کہہ کے آفت سرمول لے' کون جانے معجزہ ہو جائے تو؟"

"سالی لفنگی ہے؟" شروع شروع میں چچا میاں ان سے چڑتے تھے۔ بکواس کر دیا کرتے تھے۔ "پاگل واگل کچھ نہیں سب کو الو بناتی ہے"۔

اسی رات چچا میاں کے ایسا گردے میں درد اٹھا کہ چیں بول گئے۔ لاکھ بیچار۔ رنے بحث کی کہ درد گردہ کا انہیں پرانا مرض ہے مگر صاحب کون سنتا ہے۔

اماں نے بوا کو خوب پرچایا۔ ان سے دبی زبان سے کہا کہ میاں سے سفارش کر دیں۔ بیچارے جاہل ہیں۔

درد کم تو ہونا ہی تھا۔ مگر اماں نے اسے بوا کی سفارش کا اثر ہی سمجھا۔ اور چچا میاں کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر اب انہوں نے ایسی ویسی بات کہی تو سر پیٹ لیں گی۔ ان کا کیا ہے بگوڑے ناتھے' جو روتا جاتا اللہ میاں سے ناطہ۔ وہ تو خیر سے بچوں والی ہیں۔ وہ کسی سے بیر نہیں پال سکتیں۔ ابا کو تو انہوں پہلے ہی قسم دلا دی تھی۔ کہ اگر بوا کی شان میں ایک لفظ بھی کہیں تو ان کا مرا منہ ہی دیکھیں۔

ابا کہتے تھے یہ پیری مریدی بدعت ہے۔ مگر اماں کو عاقبت سے اپنا سہاگ زیادہ پیارا تھا۔

جب بوا اور گھل مل گئیں تو ایسا لگا جیسے اللہ میاں سے سمجھوتہ ہو گیا۔ بوا کے ناطے غازی میاں بھی اپنے کچھ لگتے تھے۔

موڈ میں ہوتیں بوا تو کبھی رات کو بھی رہ جاتیں۔ ہم لوگ ان کے ساتھ سونے کے لئے لڑا کرتے۔ انہیں سونگنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ بھینی بھینی تازہ کھدی ہوئی مٹی کی سی مہک آتی تھی۔ کئی دن غائب رہنے کے بعد جب دور سے ان کے گانے کی آواز سنائی دیتی۔ تو ہم لوگ پاگلوں کی طرح غل مچاتے دوڑتے۔ چیونٹیوں کی طرح لپٹ جاتے۔ اور انہیں گھسیٹ لاتے۔ وہ آواز جسے سن کر روح فنا ہوا کرتی تھی۔ پھر لحن داؤدی کا اثر کرنے لگی۔

ان کے آتے ہی گھر کی فضا جاگ کر کھلکھلا اٹھتی ڈھول گمکنے لگتا۔

"ہو مورے راجہ۔ دلی سے بید لاتا"۔

"بنج بھری دیکھے دھیرے دھیرے"۔ وہ نئے گیت نئی دھنیں سناتیں۔

"ساون آئے گوا بھائی کا بھولا نہ پڑے"۔ گھٹائیں جھوم کر آتیں۔ پھواریں پڑتیں۔ جوان دلوں میں امنگیں انگڑائیاں لینے لگیں ...... قدسیہ خالہ کی آنکھوں میں چنگاریاں سلگنے لگتیں۔ جھولا کون ڈالتا۔ قدسیہ خالہ کو تو جھولا جھولتے دیکھ کر چکر اور متلی شروع ہو جاتی۔ مگر بوا کسی کے گھر سے رسی اٹھا لاتیں۔ ہم رسی پر تکیہ رکھ رکھ کر جھولتے۔ بوا لمبی لمبی تانیں اٹھاتیں۔ ان کے ساتھ پلنگڑی پر لیٹی قدسیہ خالہ بھی آواز ملانے لگتیں۔

"جیا ترسے بد روا برسے
سکھی ری دن کیسے کٹیں گے بہار کے"۔

شبیر ماموں دور بیٹھے مجرموں کی طرح فرش کو گھورتے جیسے وہی بادل برسا کر کسی کا جی ترسا رہے ہیں۔ اور قدسیہ خالہ کی زندگی کی بہار کے دن جو کٹھن بیت رہے ہیں۔ اس کی ذمہ داری انہیں پر آتی تھی۔ قدسیہ پرائی تھیں۔ وہ تو شجر ممنوعہ تھیں چھپکے چھپکے مولویوں سے فتوے لئے۔ وکیلوں سے بات چیت کی۔ مگر یہ اس وقت کی بات ہے۔ جب خلع بل پاس نہیں ہوا تھا۔

پہلے تو خاندان کی ناک کٹنے کے ڈر سے طلاق کا خیال بھی کسی نے نہ کیا۔ پھر جب خاندان کے کچھ باغی لوگوں نے نانی بیوی کو راضی کیا تو قدسیہ خالہ کے دولہا کو ضد سوار ہو گئی۔ بوا نے اپنی ایک آزاد دنیا بنا لی تھی جہاں وہ دنیا کو ٹھوکر مار کے راج کرتی تھیں۔ مگر آخر کو عورت تھیں۔ لاکھ دروازے بند کئے پھر بھی کوئی جھری رہ گئی۔ ہمیں وہ واقعی اچھی لگتی تھیں۔ ان سے پیار بھری ضدیں کرتے۔ وہ جاتیں تو ماتم کناں پیچھے لگ جاتے۔ ناچار لوٹ آتیں۔

"بوا یہ بچے تو تمہارے پیچھے دیوانے ہو گئے ہیں۔ ان کم بختوں کو بھی اپنے سنگ لے جاؤ"۔ اور بوا اپنا دورہ ملتوی کر دیتیں۔ بوا پاگل نہ ہوتیں تو سونے میں تولنے کے قابل تھیں۔ کام کاج میں بھی ہاتھ بٹانے لگی تھیں۔ صفائی کا انہیں جنون تھا۔ بچوں کی فوج لے کر جدھر پل پڑتیں۔ نوکروں کوڑا نکال پھینکتیں۔ ابا کی پنشن کے بعد وطن چلی چلیں تو کیا کہنے۔

"کیا اس کا علاج نہیں ہو سکتا"۔ اماں نے حکیم صاحب قبلہ سے پوچھا۔ جو قدسیہ خالہ کا علاج کیا کرتے تھے۔ اور دوسرے تیسرے آتے رہتے تھے۔

"ہوں کیوں نہیں سکتا۔ بیگم صاحب! دنیا میں کونسا مرض ہے جس کا طب میں علاج نہیں۔ مسہل دیئے جائیں انشاء اللہ دماغ صحیح حالت پر آ جائے گا"۔

حکیم صاحب قبلہ کے پاس ہر مرض کی بس ایک دوا تھی' املتاس کے جلاب! جب قدسیہ خالہ کو بہت وحشت ہوتی تو یہی جلاب دیئے جاتے۔ ان جلابوں سے جان کے ساتھ جسم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھنے کا یقین ہونے لگتا۔ رُو بہ صحت ہونے کے سوا بیچاری کو کوئی صورت نظر نہ آتی۔ پھر کافی دن تک وہ پلک جھپکاتے بھی ڈرتی

تھیں کہ لوگ اسے دورہ سمجھ کر کہیں علاج پر نہ تل جائیں چچا میاں کو بھی درد گردہ کے لئے وہی جلاب دیئے گئے۔ پہلی خوراک کے بعد وہ حکیم جی کو قتل کرنے کے ارادے کرنے لگے۔

"جسم کی گرمی دماغ پر چڑھ جاتی ہے۔ پیٹ کی صفائی سے تمام فاسد مادے خارج ہو جاتے ہیں"۔ وہ مسہل کے فوائد بیان کرتے اور ہر کوئی قائل ہو جاتا۔ مگر بوا سنی ان سنی کر دیتیں۔

"ارے رہن دیو۔ ای بید کا بچہ کا ہمرا علاج کرہئے"۔ ان کی بیماری پر زیادہ بحث نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایک دم اکتا کر بھاگ کھڑی ہوتیں۔

بوا کے علاج کی بات چل ہی رہی تھی کہ ایک درد ناک واقعہ پیش آیا ان کا پاگل پن کھل گیا۔ منجھلی بیچاری ذرا مسمسی سی تھی۔ اس کی شادی میں مستقل اڑچنیں پڑا کرتی تھیں۔ بڑے جوڑ توڑ کے بعد سہارن پور والی خالہ بھی ایک پیغام گھیر کے لائیں۔ دولہا کی اماں بات چیت کے سلسلہ میں آئیں ان پر رعب ڈالنے کے لئے اتنا گھر جھاڑا پونچھا گیا کہ ہم خود اپنے گھر میں مہمان سے لگنے لگے۔ ہر طرف ایسی چیزیں سجا دی گئیں جن کے میلے ہو جانے اور ٹوٹنے کے ڈر سے ہر وقت ڈانٹ پڑتی۔

بوا کئی دن سے غائب تھیں۔ ہم انہیں تین چار دن رو پیٹ کے ناامید ہو چکے تھے۔ ہونے والی سمدھن کے لئے نہایت لمبا چوڑا دستر خوان چنا جا رہا تھا۔ بیلے کی کلیوں کا گچھا آنچل میں جھلاتی کوئی نیا گیت مرمراتی حسب عادت اچانک آ گئیں پہلے تو گھر کے سوا سنگھار دیکھ کر ٹھٹکیں۔ پھر سمدھن کو دیکھ کر ایک دم الف ہو گئیں۔ ان کے بہت قریب جا کے آنکھیں بچھائیں۔ بھنویں سکیڑیں جیسے کوئی بہت باریک سی جوں ڈھونڈ رہی ہوں۔ حالانکہ سمدھن خاصی واضح تھیں۔ ٹھنگنی تو ضرور تھیں مگر قد کی لمبائی کی کمی چوڑائی میں پوری ہو گئی تھی۔

بوا کے رویہ سے اماں ذرا گھبرائیں۔ ان کا دھیان بٹانے کے لئے ادھر ادھر کی فضول باتیں کرنے لگیں۔ مگر بوا نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور سمدھن سے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"اے بنی' کون چکی کا پسا کھات ہو؟"

سمدھن کے چہرے پر بہت سے عضلات پھڑکنے لگے۔

سیاہ اور چکنی ناک میں ہیرے کی لونگ بھڑکنے لگی۔

اور ایسا لگا سمدھن ایک دھماکہ سے پھٹنے والی ہیں۔

"اے بوا ذرا یہ برف کا پانی مردان خانہ میں لے جاؤ"۔ انہوں نے بوا کو گھسیٹ کر سمدھن کی جان بچائی۔ "سنجھلی کا پیغام آیا ہے۔ دولہا باہر بیٹھا ہے۔ ذرا دیکھ کر تو آؤ کیسا ہے"۔ اماں نے پھسلا کر انہیں باہر بھیج دیا۔

"نگوڑی سڑن ہے"۔ اماں نے معذرت چاہی۔

مگر سمدھن کبیدہ خاطر ہو گئیں۔

بوا گئیں اور الٹے قدموں لوٹ پڑیں۔ برف کے گلاسوں کی کشتی انہوں نے دھم سے چوکی پر پٹخی اور ماتھا کوٹنے لگیں۔

"اے موری میا۔ ای دلہا ہے کہ تمباکو کیر پنڈا۔ اوپر سے بیت بھرکا"۔ انہوں نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر بائیں ہاتھ کا بالشت بنا کر کھڑا کیا۔

"بھائی ای جوڑی تنکو ٹھیک نہیں۔ دلہا کوئی کام کا نہیں کاہے بیٹا کا نصیب پھوڑت ہو۔ اے سمدھن کوئی اپنی شکل کی پری جات ڈھونڈ کر لاؤ پوت کے لئے۔ ہری بٹیا کا بکسو۔"

سمدھن پھٹیں تو نہیں لیکن سنجھلی کو انہوں نے اسی وقت بخش دیا۔

بوا نہایت خفا گلیاتی رہیں۔ اماں کے قابو میں خاک آتیں کھونٹی سے ڈھول اتار کے کھروا تال اڑانے لگیں.....

"کالا بلم ہم نا لئے دیدی۔ کالا بلم"

"جب مورے سیاں سیجوں پہ آئیں ہیں

اس ماروں لات آنان گرے دیدی۔

کالا بلم....... ہم نا لئے۔

سنجھلی کے نصیب میں اڑچنیں ہی لکھی تھیں۔ سارے گھر نے بوا کی ٹانگ لی۔ مگر ڈھول لڑھکا کے وہ بڑبڑاتی چلی گئیں۔

"کواں ماں ڈھکیل دیو دھی کا..... ہاں....."

ہفتوں کے لئے غائب ہو گئیں۔ ایسا لگا جیسے اب کبھی نہیں آئیں گی۔

گھر میں سونا پڑ گیا۔ قدسیہ خالہ کے دورے پھر جلدی جلدی وارد ہونے لگے مزاج بھی بہت جھلا ہو گیا۔ پہلے تو ہر بات نانی بیوی کی مان لیتی تھیں۔

"اے بٹی قدسیہ ذرا سا دودھ پی لو"۔

"اچھا بی اماں"۔

"بٹی اب لیٹ جاؤ۔ کب سے کھونٹا سی بیٹھی ہو"۔

"اے ہے کب تک پڑی رہو گی۔ اب اٹھ بیٹھو"۔

غرض اٹھو بیٹھو۔ کھاؤ پیو۔ نانی بیوی کی جان کو قدسیہ خالہ روگ کی طرح لگ گئیں تھیں۔

ہر وقت انہیں کا ماتم! ہر دم نگاہیں انہیں پر جمی رہتیں اس کے سوا کام ہی کیا تھا انہیں۔ قدسیہ خالہ ہر بات پر اچھا' بی اماں کہے جاتیں۔

ایکا ایکی نجانے کیوں نانی بیوی کو جھڑکنے لگیں۔ دونوں میں تو تو میں میں ہونے لگتی۔ کبھی قدسیہ خالہ روتیں کبھی نانی بیوی' بیچ میں دادی اماں پھاند پڑتیں۔ ایک ایک کر کے سب لپیٹ میں آ جاتے دو پارٹیاں بن جاتیں۔ بات کہیں سے شروع ہو کے کہیں ختم ہوتی۔

ددھیال اور ننھیال دو کیمپ بن جاتے۔ سات پیڑھی تک حملے ہونے لگتے۔ پھر منہ تھوتھائے سب ایک دوسرے سے تنے رہتے۔

سب لڑائیاں قدسیہ خالہ کے مورچہ سے شروع ہوتیں دن بدن ان کی طبیعت میں تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔ خوب لوگوں کے دل دکھتے اور انہیں مزا آتا۔ شبیر ماموں سے بھی وہ کھنچی کھنچی رہنے لگیں۔

"مری بار کیوں دیر اتنی کری"۔ وہ قدسیہ خالہ کی دلپسند چیز سنانے لگے تو وہ پیٹھ موڑ کر پڑ گئیں' بیچارے منمنا کے رہ گئے۔

"جائیے نا' پھر رات ہو جائے گی۔--- برسات کا زمانہ ہے"۔ وہ رحم کھا کر رکھائی سے کہتیں۔ اور وہ کچھ احسان مند سے اٹھ کر چلے جاتے خیال تو ہوا ان کا۔

پھر ایک دن ہم خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ وہ ہمیں مل گئیں۔ بہار کا موسم تھا۔ جنگل ٹیسو کے پھولوں سے دہک رہے تھے۔ آنکھوں میں لال لال رنگ بھرا جاتا تھا۔ وہ ایک انگاروں سے درخت کے پاس رک کر اپنی سلیپر میں سے ریت جھاڑ

رہی تھیں۔ گلابی دوپٹہ پھولوں کے عکس سے آتشیں ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بہاریں رقصاں تھیں۔ جیسے اپنے محبوب سے مل کر آئی ہوں یا ملنے جا رہی ہوں۔

ہم لوگ ان پر ٹوٹ پڑے۔ محبت انسان کو کتنا بے بس کر دیتی ہے۔ ہماری بے قراری پر وہ کھل اٹھیں۔ گلے میں موتی بجنے لگے۔

"ارے بھائی چلت ہیں' تنک دم تو لیبو"۔ ہم انہیں گھسیٹنے لگے۔ ایک بار انہوں نے پیچھے ٹھٹک کر دیکھا۔ اور بڑی لجاجت سے کہا۔

"ابے لوٹ کے آوت ہیں"۔ ہم بوکھلائے وہ کس سے ابھی لوٹ کر آنے کا وعدہ کر رہی تھیں۔ وہاں تو کوئی بھی نہ تھا! چلیں' پھر رک گئیں۔ پھر بگڑ کر بولیں۔ "ہم سے نکھرے نہ کرو ہاں' ہم کہے دیت ہیں۔" پھر چلنے کو مڑیں۔ مگر پھر جیسے کوئی ناگوار بات سنی۔ اور تیور چڑھا کر زور سے ڈانٹ کر بولیں۔ "اچھا جاؤ نہ آویں گے۔ دیکھت ہیں تم ہمرا کیا کرلیت ہو۔ ہمرا اعتبار ناہیں کرت ہو..... ہمری بلائے سے"۔

وہ ہوا سے لڑ رہی تھیں اور اپنی ٹانگوں کا یہ حال تھا کہ بہی جاتی تھیں۔ اگر ہم واقعی انہیں اتنا نہ چاہتے ہوتے تو کبھی کے بھاگ کھڑے ہوتے۔

بوا کے آنے سے کائیں پائیں مچ گئی۔ نہ جانے کیا اتفاق تھا کہ جب وہ آئیں تو یا تو کوئی پھلوں یا مٹھائیوں کا پارسل آ جاتا یا کوئی اچھی سی خبر آتی۔ انہیں دیکھ کر سب کے دل چونچال ہو جاتے۔ لڑائی ہو رہی ہوتی تو ختم ہو جاتی یا غل غپاڑے میں لوگ بھول جاتے۔ قدسیہ خالہ اپنی نامرادی جھٹک کے اٹھ بیٹھیں۔

باتیں کرتے کرتے بوا ایک دو تیوریاں چڑھا کر سپاٹ دیوار کو گھورنے لگیں۔

"جاؤ---- نہ آئیں گے!" انہوں نے ہوا کو ڈانٹا۔ سب سہم گئے۔

"کیا ہوا؟" اماں نے پوچھا۔

"بھائی ہمرا کچھ کھائے گوا۔ ہم پر بھروسہ نہیں۔ کہت ہے ہمری آشنائی ہے! ہم نین لڑاوت ہیں"۔ وہ چلا چلا کر بالے میاں کی شکایت کرنے لگیں۔ "ارے ہم کا سمجھت کا ہے۔ ہم کوئی پتریا ہن کھانگی ہن؟"

"اوئی!" اماں اداس ہو گئیں..... "ہائے پگلی!" انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"جل کے مرنڈ ہوا جات ہے۔ کہت ہے ہرجائی ہن!" وہ خیالی محبوب بالکل

چوں چوں کا مربہ تھا۔ کچھ جیمس بونڈ اور کرشن مراری کا مجموعہ سمجھ لیجئے۔ جیمس بونڈ تو زمانہ میں ہیرو رہ چکا ہے۔ وہ چاہے داستان امیر حمزہ کا ہیرو ہو۔ حاتم طائی ہو یا الہ او دل کی صورت میں ظاہر ہو۔ اور کرشن مراری کی جھلک شاید اس لئے تھی کہ زیادہ تر لوگ گیت انہیں کی شان میں ہوتے ہیں۔ بالے میاں بالکل وہی شرارتیں کرتے تھے۔ آنچل پکڑنا۔ کلائی مروڑ کر چوڑیاں مرکا دینا۔ اور کبھی غصہ آ جائے تو پڑ مار دینا۔ یا کشتی لوٹ دینا

ان میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو ایک طرح دار نوجوان میں ہونا چاہئیں۔ کچھ بھی ہو بوا کے بالے میاں قدسیہ خالہ کے شبیر ماموں سے زیادہ زندہ اور دل چسپ تھے۔ ہمیں بوا کی ہر بات یقین آ جاتی۔ انہیں میاں دکھائی دیتے تھے تو اس میں تعجب کی کونسی بات تھی۔ ہمیں خود بادلوں میں ہاتھی گھوڑے اور ریلی پرانی نونی' گلی دیواروں کے اکھڑے ہوئے پلستر میں اندر سبھا کا اکھاڑا جما نظر آتا تھا ہمیں تو وہ پاگل بھی نہیں لگتی تھیں۔ اگر ایسے پاگل ہر گھر میں دو چار پیدا ہو جائیں تو زندگی کتنی ہلکی پھلکی ہو جائے۔

"اے بوا ذرا ادھر آؤ"۔ اماں نے مطلب کی بات کہنے کے لئے انہیں پھسلایا۔ شاید میاں سے خفا تھیں۔ اس لئے اماں نے جب حکیم جی سے علاج کروانے کی تجویز پیش کی تو بدکیں نہیں۔ ایسا لگا غور سے سن رہی ہیں۔

"ارے اب کا علاج کروایں۔ او کم بکھت ہمکا روگ ایسا لگائے دس ہے۔ کہ ہم کا کھتم کردیے۔ بات بات پر کر کر کرت ہے۔ ہمرے اوپر دھونس جماوت ہے"۔

کھونٹی پر سے ڈھول اتار کر بڑے تاسف سے دیکھتی رہیں

"ای چوہیا مال جادی کا ہیجہ سمیٹے چھنال' سب کاٹ ڈارس۔

جب ڈھول سے ناامید ہو گئیں تو ویسے ہی بالے میاں سے لڑنے لگیں۔

"میاں تورے نکھرے ہم نا سہیں گے۔

ارے تم چڑھیو گھوڑا ہم ہاتھی چڑھیں گے

بلما تورے نکھرے.....

خوب خوب سیاں کو کھریدا وہ کوٹھا چڑھیں تو یہ پہاڑ چڑھیں۔ وہ ان کی ریس

میں پہاڑ چڑھے تو یہ پاتال چڑھیں۔ غرض بیچارے کو چیں بلوا دی۔

"ارے دیکھت جاؤ۔ آپ ہی جھک مار کر ہمرے پیر پکڑیئے"۔

انہوں نے بڑے اطمینان اور وثوق سے کہا۔

دیوانے بھی اپنی دنیا کے شہنشاہ ہوتے ہیں۔ معاذ اللہ کیا غرور تھا بوا کو اپنے تئیں ! شاہوں کے شاہ ان کے قدم لیتے تھے۔ ان کی ایک مسکراہٹ پر مٹے دھرے تھے۔ ایسا معرکے کا چاہنے والا مل جائے تو ہوش و خرد کی دنیا کو کیوں نہ لات مار دے انسان؟

پنجرے میں بند پرندے' فضا میں اڑنے والی آزاد چڑیوں کی اڑان دیکھ کر تیلیوں سے سر پھوڑتے ہیں۔ جب نہیں نکل پاتے تو انہیں پھنسانے کے لئے شکاری سے ساز باز کرتے ہیں۔ پرندوں کو پھانسنے کے لئے پالتو یا پر کٹے پرند استعمال کئے جاتے ہیں۔

گھر کی چار دیواری میں دنیا اور سماج کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی بھلی بیویوں کو بھی بوا کی یہ آزادی شاق گذرتی تھی۔ عورت ہو کر وہ مرد کے حقوق داب بیٹھی تھیں۔ جو سب کو کھلتا تھا۔ بوا نے دوا پینے کی حامی تو نہ بھری مگر ہائے توبہ بھی نہ مچائی۔

اماں نے کہا موئی کی ہاں' اور نا' کی بھلی چلائی' اس کے فائدے کے لئے علاج ہو رہا ہے۔

رات بھر بے قلعی پتیلے میں املتاس کی پھلیاں' ہڑ بہڑ' آملا اور بھی اس قبیلہ کی مکروہ دوائیں اوٹائی گئیں۔ نانی بیوی نے تہجد کی نماز کے بعد آنچ پھر تیز کر دی۔ بوا کو پھسلا کر روک لیا گیا تھا۔

صبح سویرے نہار منہ خوراک پینی تھی۔ ہم لوگ بھی جاگ گئے۔ سارا گھر املتاس کی بک سے سڑ رہا تھا گھلے ہوئے گوبر کے رنگ کی بڑا بادیہ بھر کے' دیکھ کر آنتیں حلق کی طرف اچھلنے لگیں۔

بوا نے بہت رسیاں تڑائیں مگر اماں نے اپنی جان کی قسمیں دیں۔

نانی بیوی نے "میاں" کا واسطہ دیا۔

انہیں پکڑ کر موری کے پاس اکڑوں بٹھایا گیا۔

"دوپٹے سے ناک پکڑ لو"۔ دادی اماں نے رائے دی۔ سارا گھر ٹھٹ لگا کے جمع ہو گیا۔ جیسے مینڈھوں کی لڑائی ہو رہی ہو۔ بوا نے ناک ڈوپٹے سے دابی۔ اور تائی اماں کی مدد سے بادیہ سنبھالا۔

"نہ پلاؤ ..... اماں بی .... ہے ہے آپا بیگم رہنے دو موئی کو"۔ ایک دم قدسیہ خالہ سب کے ہاتھ جوڑنے لگیں۔ "اچھی تائی اماں ...."

وہ یہ جلاب جھیلے ہوئے تھیں۔

"اے ہے لڑکی! دماغ خراب ہوا ہے تیرا ...." ہم سب ناک دبائے موری کے پاس اکڑوں بیٹھے ٹی ٹی کر رہے تے۔

"نہیں تائی اماں ..... اچھی نہ پلاؤ۔ میں پی چکی ہوں اللہ بچائے"۔

"پی چکی ہو اسی لئے تو آپے میں ہو ذرا۔ نہیں تو بنو اب تک تو تنکے چننے لگتیں۔" بڑے اہتمام سے بوا نے ایک گھونٹ منہ میں لیا۔ اور پھر سے تائی اماں کی چھاتی پر کلی کر دی۔ بادیہ موری میں پٹخ وہ بھاگیں نلکہ کے پاس۔ مار کلیاں کرتے کرتے الو ہو گئیں۔

"موت اولے ای حرامی بید کا۔ ہمکا اپنی مہتاری کیر کلیجہ پئے کا دے دہس"۔

وہ ہر کلی پر حکیم صاحب کو ایک وزنی سی گالی دیتیں۔ اوکی کبر ماں کیڑے پڑیں"۔

"اے ہے' اتنی قیمتی دوا موری میں لنڈھادی۔ نہ پینی تھی تو منہ سے پھوٹتیں۔ قدسیہ کے کام آ جاتی"۔

قدسیہ خالہ لرز اٹھیں

"ارے ہم کہاں پھنکا۔ اور ہاتھ مار دیتیں -!" وہ الزام بالے میاں پر تھوپ کر الائچیاں چبانے لگیں۔

"ان سے تو لڑائی تھی"۔ تائی اماں جل کے رہ گئیں

"ارے او ایک بدماس ہے۔ اوسے کون لڑائی کرے رات کا ہمرے پیچھے پڑ گوا۔ ہمرے پیر پکڑ کے رونے لگا"۔

معاذ اللہ!۔

سب کے سب کلس کے رہ گئے۔ بوا نہایت بے تعلقی سے اٹھیں۔ اور

چلدیں۔

"اے لو کہاں چلیں۔ سنو"۔

"ہمکا جاؤے کا پڑی۔ پھی کھپا ہوئی جیہے۔" وہ پیار سے انہیں دیکھتی ہوئی چلدیں۔

"سیاں توری گودی پھل گیندا بن جاؤں گی"۔ سخت ملاپ ہو گیا۔ شہر میں تھیٹر آیا ہوا تھا۔ سب تڑپ رہے تھے۔ وہ مزے سے بلا ٹکٹ روز جاتیں۔ وہاں سے نئے نئے گیت اڑا کر لاتیں۔ عشق و محبت کے سلگتے ہوئے دعوے۔

قدسیہ خالہ کے طور بھی بدلے نظر آ رہے تھے۔ اب وہ راشد الخیری کی "صبح غم" اور "شام زندگی" پڑھ کر ہچکی باندھنے کے بجائے مثنوی زہر عشق چھپا کر پڑھا کرتیں۔ اور راتوں کو گھنٹوں صحن میں ٹہلا کرتیں۔

"قبلہ وہ مردار جلاب ہرگز نہیں پئے گی"۔ اماں نے قبلہ حکیم صاحب سے شکایت کی۔

"کوئی مضائقہ نہیں۔ میرے پاس بحمد اللہ اور ادویات ہیں۔ ایسی اس کے فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلے۔ یہ تین گولیاں پان میں یا مٹھائی میں رکھ کر دے دیجئے۔ تین تین دن کے وقفے سے انشاء اللہ مکمل افاقہ ہو جائے گا۔

"لو بوا پان کھاؤ"۔ آتے ہی اماں پٹاری کھسکا کر مصر ہو جاتیں۔

"ناہیں بھائی' ہمرا منہ بکسائے جات ہے"۔ وہ صاف کترا جاتیں۔

مگر بیویوں کو سوائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کے اور کوئی کام ہی نہ ہو تو کوئی کہاں تک بچ سکتا تھا۔ شاید بالے میاں سے کچھ ان بن ہو گئی تھی یا ان سے غفلت ہو گئی۔ بوا کے حلق سے پہلی خوراک اتار دی گئی۔ اور لوگ اثر ہونے کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ مگر بوا کو کچھ نہ ہوا اتنا ضرور فرق ہوا کہ ہم نے انہیں کبھی اس دن سے پہلے سوتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نیم کے نیچے کھاٹ ڈالے لیٹی تھیں اور سو گئیں۔

سب کو یقین آ گیا کہ ضرور بالے میاں نے کوئی تکڑم کی ہو گی کہ گولی پھس ہو گئی یا شاید نہار منہ نہیں دی گئی اس لئے اثر نہ ہوا۔ بوا ایک دم ہڑبڑا کے اٹھیں۔ اس دن سے پہلے ان کے چہرے پر ایک عجیب سا انجانا خوف کبھی نہ دیکھا تھا۔ واقعی

وہ غیب داں تھیں کچھ غصہ میں اٹھ کر چلی گئیں۔

"اے ہے بھئی خاک ڈالو موئے علاج پر کہیں کوئی الٹی سیدھی بددعا لگ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ پہنچے ہوئے لوگوں سے الجھنا ٹھیک نہیں"۔

اماں نے فیصلہ کیا۔

"حیرت کا مقام ہے کہ کوئی ٹس سے مس نہ ہوئی"۔ نانی بیوی نے مان لیا۔

مگر شام کو حیرت کے مقام ڈھے پڑے۔ بوا کی چمارن بھاگی آئی کہ بوا کو صبح سے دست لگے ہیں۔ اب الٹیاں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ اماں نے بوکھلا کر قبلہ حکیم صاحب کے پاس آدمی دوڑایا۔

"گرمی نکل رہی ہے!" قبلہ حکیم صاحب نے فرمایا اور کوئی عرق دیا جس سے گرمی نکلنے میں ذرا کمی ہوئی مگر بھینسوں بخار چڑھ گیا۔

کئی دن اماں بلاتی رہیں مگر وہ نہیں آئیں۔ وہ پہلے ہی کیا بہت کھاتی تھیں۔ چمارن آ کر ان کے لئے پتلی کھچڑی یا ساگودانہ لے جاتی۔ مگر وہ ہاتھ بھی نہ لگاتی تھیں۔ بس پانی پئے جاتی تھیں۔

ہفتوں بعد آئیں تو ہمیں ایسا لگا وہ ہم سے ذرا دور ہو گئیں تھیں۔ جیسے ہم تو بچے ہی رہ گئے۔ اور وہ سیانی ہو گئیں۔ ہم ان کے گلے میں جھولے تو تیورا کر بیٹھ گئیں۔

"ای کا مسکری کرت ہو"۔

وہ ترش روئی سے بولیں گویا اس سے پہلے ہم ان کے گلے کا ہار کبھی نہ بنتے تھے۔ ان کے کپڑے بھی میلے ہوئے تھے۔ بال خشک اور الجھے ہوئے۔ پہلے ہی دبلی پتلی تھیں۔ اب اس جھٹکے میں اور بھی گئی گذری ہو گئیں۔ ہم لوگوں نے ان سے ڈھول مڑھوا دینے کی فرمائش کی تو ٹال گئیں۔

اماں نے ان کے آگے مٹر کی پھلیوں کی سینی سرکا دی بیٹھی چھیلتی رہیں۔

نانی بیوی اور اماں میں اوپر ہی اوپر اشاروں میں باتیں ہوئیں۔ دونوں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ اگر باقی کی دو گولیاں اور پہنچ گئیں۔ تو مرض کا نام و نشان بھی نہ رہے گا۔

"کہو بوا میاں سے تو ان بن نہیں"۔ اماں نے ٹٹولا۔

"کوئی ہم جھگڑا کرت ہیں؟"۔ اس کا مطلب جھگڑا چل رہا تھا۔ اور نہ جانے اپنے کو کا سمجھت ہے۔ بڑا آوالاٹ صاحب کیر بچہ!" وہ جز بز ہو گئیں۔ ناچاقی ضرور ہو گئی تھی۔

ان کی چمارن کہیں پاس کے گاؤں میں زچگی کرانے گئی ہوئی تھی ویسے تو رسیاں بٹا کرتی تھیں۔ سائڈ بزنس کے طور پر ضرورت مندوں کی حاجت پوری کر دیتی۔ اماں نے روک لیا کہ رات یہیں رہ جاؤ۔

اماں حلف اٹھانے کو تیار تھیں کہ حاشا انہوں نے دوسری خوراک نہیں دی مگر دادی کہے جا رہی تھیں کہ بہو اور سمدھن میں مسکوت ہو رہی تھی ضرور دوا دی گئی جو کہ تیزابی بم ثابت ہوئی۔

مارے اجابتوں کے بوا ڈھیر ہو گئیں۔ رات کو تو ایسی لے دے پڑی کہ ابا تک بات پہنچ گئی۔ ڈاکٹر آیا اس نے دوا دی مگر وہ صبح تک ہلکان ہوتی رہیں۔

ابا خوب گرجے کہ حکم صاحب قبلہ کی خوب جوتے کاری ہونا چاہئے۔ بالکل چوپٹ ہیں۔ اور اگر آئندہ کسی کو دوا دی تو ہتھکڑیاں ڈل جائیں گی۔

دادی اماں کو کچھ اس کارخیر میں دلچسپی نہیں لینے دی گئی تھی۔ نانی بیوی کا کیس تھا اور وہ خود مورچہ پر رہنا چاہتی تھیں۔

"اے بیویو کیا ہو رہا ہے"۔ دلوی بہری بھنڈ تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہ جملہ دہرا دیتی تھیں۔

کچھ نہیں بہن' ہوتا کیا۔ تمہارا سر!" نانی بیوی جملہ کا پہلا ٹکڑا زور سے اور آخری نہایت چپکے سے ادا کرتیں۔

"ہمیں تو بھئی کوئی کچھ بتادے ہی نہیں ہے"۔ دادی اماں بسورتیں۔ دونوں میں ہمیشہ چلتی ہی رہتی تھی۔ سمدھنیں بھی تھیں اور رشتہ میں نند بھاوجیں بھی لگتی تھیں۔ مگر اصل نفاق کی بنیاد دونوں کے عقائد تھے۔ نانی بیوی پکی سنت جماعت اور دادی اماں شیعہ۔ دونوں کی چھاؤنیاں مختلف برآمدوں میں تھیں۔ نانی بیوی کے برآمدے میں صبح سے اماں آ کے بیٹھ جاتیں۔ اماں وہ محور تھیں جن کے گرد گھر کی دنیا گھومتی تھی۔ ظاہر ہے ان کے برآمدے کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی۔ اماں دادی اماں کو سلام کر کے ادھر ہی آ بیٹھیں۔ قدسیہ خالہ کے کمرے کا دروازہ ان

کے برآمدے میں ہی تھا۔ قدسیہ خالہ جو خاندان کا نہایت اہم اخلاقی مسئلہ تھیں۔ ان کے دوروں سے خوب چہل پہل تھی۔ پھر شبیر ماموں بھی ادھر ہی آ کے بیٹھتے تھے۔ اور بچے تو وہیں ہونگے جہاں غل غپاڑہ ہو۔ دادی اماں کلستی تھیں۔ ددھیال کے ناطے بچوں کو شیعہ ہونا چاہئے تھا۔ مگر نانی کا سکہ چلتا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے سنت جماعت کا پرچار کرتیں۔

اماں کی پشتی حاصل تھی۔ وہ دادی اماں کا کہنا نہ ماننے پر مسکرا کر ڈانٹتیں۔ اور ہم شیر ہو جاتے۔ مگر نانی بیوی کا کہنا نہ سنو تو ہڈیاں توڑنے کے وعدے کئے جاتے۔

دونوں طرف سے ہمیں صراط مستقیم دکھا کر جنت میں لے جانے کی کوششیں ہوتیں۔ ایک کلمہ دادی اماں سکھاتیں تو نانی اماں سنت جماعت کا کلمہ سکھاتیں۔ گڑبڑا کر ہم دونوں کی کھچڑی پکا دیتے اور قبلہ حکیم صاحب کی تیر بہدف گولیوں کا سا اثر ہوتا۔ ذہنی جلاب والی کیفیت تھی۔ بہشت کے دروازے کی چابیاں غلط ملط ہو جاتیں۔ اور دونوں طرف سے کفر کے فتوے ملنے لگتے۔

نانی بیوی دادی اماں کی مجلسوں کی چوٹ پر میلاد شریف کرتیں۔ مٹی کے سکوروں میں کلتیاں ملتیں' ہم فوراً کٹر سنی ہو جاتے۔

مگر دادی اماں کے برآمدے میں جھاڑ فانوس پر سے تھیلیاں اتاری جاتیں۔ اور خضری رکھی جاتی تو ہم قطعی ان کے ہو رہتے۔ جب لرزتی آوازوں میں نوحے پڑھے جاتے۔ تو ہم کالے کرتے پہن کر خوب ماتم کرتے۔ نانی بیوی دمہ کے لگاتیں۔ اور رنگ برنگا کڑکا دیکر پھسلانا چاہتیں۔ مگر محرم شریف کے مہینہ میں دادی اماں کی پارٹی میں رہنا زیادہ مفید ثابت ہوتا تھا۔ ہمارے لئے ادھر ہی جنت کے دروازے کھل جاتے جدھر تر مال زیادہ ہوتے۔

"کیوں ری تو سنن ہے کہ شیعہ"۔ دادی اماں عموماً پوچھا کرتیں۔

"شیعہ"۔ ہم مستعدی سے جواب دیتے۔

اری رادضی ہے کہ سنت جماعت"۔ نانی بیوی بھی عموماً مٹھائی بانٹنے سے پہلے پوچھتیں۔ شکر ہے دونوں کے کیمپ دور دور تھے۔ اور دونوں کچھ اونچا سنتی تھیں۔

بوا کے علاج کا سوال کافی تلخ صورت اختیار کر گیا۔ دادی اماں نے ابا کے کان

بھرے انہوں نے کچھ کہہ دیا۔ اس پر اماں خوب روئیں۔

ابا کی پنشن کا زمانہ قریب آ رہا تھا خوش حالی کے زمانے میں دل وسیع ہو جاتے ہیں۔ اپنوں پر پیار آنے لگتا ہے۔ کال پڑنے پر محبت کے سوتے بھی سوکھ جاتے ہیں۔ ساری عمر انلے تللے خرچ کیا۔ اب چند سال میں اس فضول خرچی کا انتقام لینے کی فکر پڑی۔

کوا بولتا تو دم نکل جاتا۔ اب آنے والا ہے کوئی مہمان۔ ہمارے گھر روز ہی کوا بولا کرتا کبھی ددھیال والے چلے آ رہے ہیں تو پلڑا برابر کرنے کے لئے ننھیال والے کیوں چوکتے۔ پھوپیاں' چچیاں' تائیاں۔ مع شوہروں اور بچوں کے آتیں تو ماموں' خالائیں بھی کنبہ لے کر آ جاتیں۔

مہمان دو مورچوں میں بٹ جاتے۔ دو دستر خوان لگتے جاسوس چھوڑے جاتے۔ دیکھ کر اطلاع دیں کہ مخالف پارٹی کے ساتھ تر بتر رعاتیں تو نہیں ہو رہی ہیں۔

عموماً ننھیال پارٹی زیادہ بھاری ہوتی تھی۔ کیونکہ اماں ان کے کیمپ میں ہوتیں۔

ابا کو پارٹی پالیٹکس میں پڑنے کی فرصت ہی نہیں تھی ویسے بھی وہ کماتے تھے اماں خرچ کرتی تھیں۔ بالکل وہی پوزیشن تھی جو آجکل امریکہ کی ہے ان کے سب ہی مسکا لگاتے تھے۔ خواہ کسی پارٹی سے تعلق ہو۔ ابا تو نیوٹرل تھے دونوں کا مان کرتے۔

صرف چچا میاں تھے جو دونوں پارٹیوں میں لڑائی کروانے کی تاک میں رہتے۔ اماں جان ددھیال والوں کی زیادہ خاطر کرتیں۔ مگر ایسے کہ صاف غیریت کی بو آتی۔ اگر کوئی کھانا کم ہوتا تو باآواز بلند اس کا اعلان کرتیں۔

"ادھر بجوا دو ہم لوگ تو چٹنی اچار سے بھی کھا لیں گے"۔

مگر چچا میاں نمبر ایک کائیاں وہ ننھیال پارٹی کے ساتھ کھانا کھاتے مع اس نایاب کھانے کے جو کم پڑ گیا ہوتا پھر جا کر ددھیال پارٹی کے سامنے کہتے۔

"بھئی آج کلیجی گردے لاجواب پکے تھے"۔ کلیجی گردے بالکل نہیں پکے تھے۔ اے ہے کتنے دنوں سے جی کر رہا ہے۔ ذرا سے ادھر نہ بھیجے۔ سب ادھر ہی

زہر مار کر لئے"۔

پھر دوسرے دن جب کچہری سے لوٹ کر ابا انہیں سلام کرنے جاتے تو وہ فوراً کلیجی گردے کی شکایت کرتیں۔ ابا اماں سے کہتے۔

"بھئی کلیجی گردے ادھر کیوں نہ بھجوائے"۔

"لو اور سنو! اے کلیجی گردے کب پکے تھے؟ اماں بگڑ کھڑی ہوتیں۔

"اے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بکریدن ڈونگا بھر کے لے گئی"۔

چچا میاں کا بھروسہ کر کے دادی اماں قسم کھاتیں۔ خوب حلف اٹھتے۔ ایمان بیچ میں گھسیٹے جاتے۔ پھر چچا میاں کو بلایا جاتا وہ معصوم صورت بنا لیتے۔

"کیسے کلیجی گردے! بھئی کتنی بار کہا ہے کہ چاولوں کے ساتھ تربوز نہیں ہونا چاہئے۔ میرے گردے میں بے کلی ہو رہی ہے درد شروع ہو گیا تو ....."

چچا بات پلٹتے۔

"ادھر کلیجی گردے کھائے تم نے؟" تائی اماں ڈٹ جاتیں۔

"کب بھئی ہمیں نہیں ملے۔ یہ زیادتی ہے تر مال پکتے ہیں اور لوگ ڈکار جاتے ہیں"۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا جھگڑا ہے ایک دوسرے کی گواہیاں دلواتا۔ پھر کوئی دکھی دل رو پڑتا۔ ادھر سے جواب میں کوئی شروع ہو جاتا۔ پرانے زخم تازہ کئے جاتے۔

"میں نے ذرا چوبے دتیاں منگوائیں تو صاف ٹال گئیں"۔

"وہ زور کا طمانچہ مارا نگوڑے کو کہ پورا پنجہ اتر آیا"۔

"اے بہن! اپنوں کی بات اور ہے ....."

"ہاں بھئی! ہم تو دشمن ہیں"۔

جب خوب سب ہلکان ہو جاتے تو چچا میاں سب کو ڈانٹتے۔

"کیا کنجڑوں قصائیوں کی طرح لڑا جا رہا ہے۔ یہ بھی کوئی شرافت ہے ..... واللہ بوٹی بوٹی پر کتوں کی طرح لڑائی ہوتی ہے"۔

ان کے ڈانٹنے پر سب تھکے ہارے نادم ہو کر سو جاتے۔ ددھیال والے خوش تھے کہ ننھیال پارٹی پر بوا کے بارے میں جوتے پڑے۔

بوا بہت بیمار پڑیں۔ تیسری خوراک کی نوبت ہی نہ آئی۔ دوسری خوراک نے

انہیں کوئی کام کا نہ رکھا۔ اگر قیس کو قبلہ حکیم صاحب کی تین خوراکیں دی جاتیں۔ تو یقیناً وہ مجنوں نہ بننے پاتا نہ اس میں صحرا نوردی کا دم رہتا نہ لیلیٰ لیلیٰ پکارنے کی کلیجہ میں طاقت رہ جاتی۔ حضرت عشق کی چوکڑی بھول جاتے۔

بخار اترنے کے بعد بھی کئی دن بوا کے منہ سے مارے نقاہت کے بات نہ نکلتی تھی کیونکہ دوسری خوراک فی البدیہہ کارگر ثابت ہوتی تھی اس لئے وہ ہمارے ہاں ہی تھیں وہ دن رات خاموش آنکھیں موندے پڑی رہتیں گئے حواس واپس لوٹ آئے تھے۔ اور کافی سمجھ دار ہو گئی تھیں۔

ان کی چمارن جا کے بیٹھ رہی تھی۔ اماں ان کے بے انتہا لاڈ کرتیں۔ اپنے ہاتھ سے شوربہ بنا کر دیتیں۔ گر وہ منہ بنائے پڑی رہتیں۔ بڑی خوشامدوں سے دو چار گھونٹ پی لیتیں۔ تو یا تو الٹی ہو جاتی یا پھر بیت الخلاء کے پاس کھاٹ پڑ جاتا۔ ان کا معدہ مستقل خراب رہنے لگا۔ بغیر دوا کے ہی گرمی نکلا کرتی۔

"کہاں چلی گئیں بوا؟" ہم کبھی کبھی سوچتے"۔ وہ اکڑتی ہوئی مغرور بوا۔ بچوں کے ساتھ جامیں جھاڑتی۔ کھیتوں سے خربوزے اور ککڑیاں چراتی ہماری پاگل بوا! اللہ نے انہیں عقل کیوں واپس دیدی! وہ ہنسنا بھی بھول گئیں۔

اور گانا؟

دوسری خوراک کے بعد ان کا گلا بیٹھ گیا۔

"اللہ اب وہ کبھی نیم کے پیڑ میں جھولا ڈال کر ساون اور کجریاں نہیں گائیں گی"۔

اماں ان کی مختار عام بن بیٹھی تھیں۔ انہوں نے ان کا مکان کرائے پر اٹھا دیا۔ اور بوا مستقل ہمارے یہاں رہنے لگیں۔ چمارن واپس لوٹی تو ماتم کرتی بوا کے پاس آئی۔ بوا کی صحت نسبتاً" اچھی تھی۔ بیٹھی بھرتے کیلئے ابلے ہوئے آلو چھیل رہی تھیں۔ سردیاں شروع ہو گئی تھیں۔ اس لئے زیادہ تر باورچی خانے میں ہی بیٹھی رہتیں۔

ایک زمانہ تھا جب کڑکڑاتے جاڑوں میں بوا ایک ہلکی سی دوہر اوڑھے راتوں کو گھومتی پھرتی تھیں۔ مگر جب تو ان میں گرمی تھی۔

اماں نے چمارن کو ڈانٹ کے بھگا دیا۔ بوا چپ گردن موڑے بیٹھی رہیں

مکان کا کرایہ جمع کر کے اماں نے بوا کے لئے کپڑے بننے کو دیئے تھے جب کپڑے بن کر آئے تو بوا نے سونے کے شیروں کے منہ والے کپڑے الٹ پلٹ کر دیکھے اور واپس دے دیئے۔

"رکھ لو"۔

"اے ہاتھ میں ڈال کے تو دیکھو"۔ نانی بیوی نے زور دیا۔

"ناہیں بھائی۔ کپڑے پہننے کا کون موکا ہے"۔ وہ ترشی سے بولیں۔ اب تو بوا موقع محل بھی پہچاننے لگی تھیں۔

"دیکھو' کون کہے گا کہ یہ نگوڑی پاگل تھی۔ کیسا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے مزاج میں"۔ نانی بیوی ان کے مرکھلے پن کو ٹھہراؤ کہتی تھیں۔

بالے میاں کا کبھی ذکر بھی نہیں کرتیں۔ ہم کبھی پوچھتے "بوا! میاں کیسے ہیں"۔ تو وہ ایسے اجنبی بن جاتیں۔ جیسے وہ ان کے کبھی کوئی نہ تھے۔ انہیں پہچانتی تک نہیں۔ ہم اور چھیڑتے۔

ہرا مغز نہ کھاؤ"۔ وہ جھلا کر کہتیں۔ اور اماں ہمیں ڈانٹ کر بھگا دیتیں۔

"اے ہے اسے یاد نہ دلاؤ موئی کو۔ پھر بورا جائے گی"۔ نانی بیوی ڈانٹتیں مگر خود شرارت سے چھیڑتیں۔

"اے جان پڑتا ہے تمہارے غازی میاں تمہیں بھال گئے" بوا جیسے بہری ہوں گم بیٹھی رہتیں۔

صرف ایک دن ذرا ان کی طبیعت چونچال تھی۔

بدپرہیزی نہ کریں تو سب کھانا ہضم ہو جاتا تھا۔ اب وہ گھر کا کام کافی سنبھال چکی تھیں۔ ہلکے پھلکے کام سے اب وہ ہانڈی بھی بگھارنے لگیں۔ پانچ سیر دو وقت آٹا گوندھتیں۔ پھر روٹیاں بھی ڈالنے لگیں۔

"او تو ہرجائی ہے!" بوا نے ذرا تنک کے کہا۔ ذرا جوش میں آگئیں۔ نہا کر بیٹھی بال سکھا رہی تھیں۔ کچھ کچھ پرانی بوا ہی لگ رہی تھیں۔ ایک دم مری سی آواز میں گانے لگیں۔

ہو راجہ جی۔ سوتن کے لمبے لمبے کیس
الجھ مت رہنا۔ ہو راجہ جی۔

ان کے لہجے کا وہ وثوق غائب تھا۔

بالے میاں ان سے بے وفائی کر گئے تھے یا کرنے جا رہے تھے۔ انہیں اپنے چھدرائے ہوئے بال دیکھ کر سوتن کے لمبے کیسوں سے ڈر لگ رہا تھا۔

"ہو رابہ جی.. سوتن کے گورے گورے گال"

بوا کا سانولا سلونا رنگ مٹیالا اور گدلا ہو گیا تھا..... یکایک بوڑھوں کی طرح جھک کر رہ گئی تھیں۔ اٹھتیں تو گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر وہ تڑک بھڑک ایک سرے سے غائب ہو گئی تھی۔

بالے میاں کا پیار تج کر وہ لنڈ منڈ اور اجاڑ ہو کر رہ گئیں۔

بچپن کسی کا ماتم نہیں کرتا انہیں گھسنتا چھوڑ کر ہم آگے بڑھ گئے قدسیہ خالہ پہلے سے بہت بدل گئی تھیں بجائے ہر وقت ہم لوگوں کی چیخ و پکار کی شکایت کرنے کے وہ ہمیں خود بلا کر ہمارے جھگڑے چکاتیں سبق یاد کرواتیں۔ سردی سے چھٹے ہوئے ہاتھ پیر مانجھ کر ویسلین لگائیں یا تو کبھی وہ ادھ موئی بسوری پڑی رہا کرتی تھیں کئی کئی دن کنگھی نہ کرتیں۔ کپڑے چکٹ ہو جاتے بدلنے کا خیال نہ آتا جس کا دیکھنے والا ہی آنکھیں پھیر لے تو وہ سہاگن پھر کس کے لئے سنگھار کرے۔

سہاگ کی مروت میں دو دو کانچ کی چوڑیاں ضرور ڈالے رہتیں تھیں لوگ ان کے صبر اور وفا کے محفلوں میں قصے سنا سنا کر جھوما کرتے تھے۔

مگر ایک دم ان میں بڑی نرم و نازک سی تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی آنکھیں بند کئے لیٹے رہنے کے بجائے وہ گھنٹوں چہل قدمی کرتیں۔ رنگ بھی کچھ نکھر آیا شاید اس ابٹن کا اثر ہو جو انہوں نے قسم قسم کے مسالحے کوٹ چھان کر تیار کیا تھا۔

نانی بیوی کبھی ان کی چوٹی کرتیں۔ تو بھر بھر بکٹے بالوں کے اترا کرتے تھے جب سے انہوں نے سیکا کائی میں بال چھتر ہتھیلی چھیلا اور ناگوار سو تھا ملا کر سر دھونا شروع کیا تھا واقعی بال چمکدار اور ملائم ہو گئے تھے یا شاید ہمیں اس لئے اب ان کی سب چیزیں اچھی لگتی تھیں۔ کہ وہ ہمیں خدا کی لعنت کی بجائے شریر بچے سمجھنے لگی تھیں۔

پہلے وہ سہاگ کا مان رکھنے کے لئے ڈوپٹہ کسی بھی اودے پیلے رنگ میں ڈبو کر الگنی پر سکھا لیا کرتی تھیں اب جب سے آگرہ سے چھبیس کی ململ کا تھان منگوایا تھا

نہایت صوفیانے رنگوں کے ڈوپٹے رنگے جاتے۔ بالکل موسم کے حساب سے جوڑے بنا کر لپکا ٹانکا جاتا محرم کے لئے سبزا ساون کے لئے لہریئے دار پچ رنگ ڈوپٹے رنگے جاتے۔ ہم بڑے خوشی سے ان کے لوٹوں میں پانی بھر بھر کے لاتے ان کے افشاں لگے ڈوپٹے دھوپ میں الار الار کر سکھلاتے اور ڈھیروں ادھ کھلی کلیاں لا کر ان کے تکیہ پر ڈھیر کر دیتے۔

ان کی بالوں میں کلیاں پرو کر گیلے کپڑے میں لپیٹ کر صراحیوں کے پاس رکھ دیتے۔ شام کو وہ نہا دھو کر دھیمے دھیمے رنگ کے کرکرے غارے اور چکن کی قمیض پر چنے ہوئے ڈوپٹے اوڑھتیں پھول بھری بالیاں پہنتیں اور خلا میں دیکھ کر ایسے مسکراتیں جیسے ان کے بھی کوئی غازی میاں کھڑے ان سے چھیڑ خانی کر رہے ہوں۔

ان کے بدلے ہوئے رنگ ڈھنگ دیکھ کر گھر کی ذمہ دار خواتین کچھ کھٹکی رہنے لگیں تھیں خالہ کو دورے پڑتے تھے وہ تو برحق تھے ہر بدنصیب میاں کی ٹھکرائی ہوئی عورت کا یہی مشغلہ ہوا کرتا ہے مگر سولہ سنگھار کر کے ہار پھول پہننا اس عورت کو زیب نہیں دیتا جس کا خدائے مجازی اس سے روٹھ چکا ہو۔ اب تو بس اللہ کا شکر کر کے جو پھٹا پرانا ملے تن ڈھانک لیا جائے اور روکھی سوکھی سے پیٹ کی دوزخ بجھالی جائے دنیا دیکھے گی یہ چونچلے تو کیا کہے گی۔؟

یقیناً جنم میں تھوکے گی۔

یہ تیل پھلیل، پھول پان، دل میں فاسد خیالات کو بھڑکاتے ہیں شیطان کو شہ ملتی ہے۔

"اے، قدسیہ تیرا جی کچھ بھاری ہو تو حکیم صاحب کو بلوائے لیتی ہوں"۔

نانی بیوی ان کی تندرستی سے خائف ہو کر کہتیں۔

"نہیں تو اماں بی۔ اچھی بھلی ہوں!" قدسیہ خالہ چوروں کی طرح نظریں بچاتیں۔

"صبح پڑی اینڈتی رہتیں۔ فجر کی نماز قضاء کر دی۔

"قضاء پڑھ لی اماں بی"۔

"وہی تو میں کہوں ہوں یہ رات رات بھر الم غلم نہ جانے کیا بلا بد تر پڑھتی رہتی ہو فجر کی نماز ملے تو کیسے؟

قدسیہ خالہ آئے دن ناولوں کے وی پی چھڑاتی رہتیں کیا مجال جو کسی کو دکھائیں جیسے ہی کوئی آتا چٹ تکیہ کے نیچے چھپا لیتیں۔

"اوئی یہ جُھمکے کیوں پہنے گئے ہیں۔

کبھی قدسیہ خالہ ہاتھ گلے میں کوئی زیور ڈال لیتیں تو نانی بیوی کا منہ بکس جاتا۔ نہایت فکر مند ہو کر پوچھتیں۔

"ایسے ہی ہمارا جی کرا" قدسیہ خالہ کانوں میں جھمکے جھلا کر مسکراتیں۔

"اوئی موا جی نہ ہوا وہ ہو گیا"۔

نانی بیوی بڑبڑاتیں۔

یا تو ہر وقت ماتم کیا کرتی تھیں۔ ڈنڈا سے ہاتھ بوچے کان لئے پھرتی .... "ہائے کن ارمانوں سے بنوائے تھے زیور نگوڑی کو پہننے بھی نصیب نہ ہوئے۔ اے قدسیہ عید بقرید تو کچھ پہن لیا کر"۔

"کس کے لئے پہنوں بی اماں" قدسیہ خالہ آہیں بھر کے جواب دیا کرتی تھیں۔

مگر یہ زمانہ ماضی کی باتیں تھیں مگر اب .... " نہیں جی آثار بالکل اچھے نہیں تھے۔ یہ رات رات بھر واہی تباہی خاک پڑی کتابیں پڑھنا ٹھنڈی آہیں بھر بھر کے صحن کا فرش ناپنا اور آسمان دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ مسکرانا خاندان پر مرمٹنے والی بیٹیوں کے یہ لچھن نہیں ہوا کرتے۔ یہ سوکھے ہوئے ٹھونٹھ میں کونپلیں کیوں پھوٹ رہی تھیں۔

نانی بیوی نے تو اب قدسیہ کے دولہا کا دل پھیر دینے کی دعائیں مانگنا بھی ناغہ کر دی تھیں۔ دولہا تو خاک بھی نہ ائے ہاں شبیر ماموں پابندی سے آتے ہمیں تو ایسا لگتا تھا وہ دن بدن لمبے سے لمبے ہوتے جا رہے ہیں ایسا لگتا جیسے بازی گروں کی طرح پیروں میں بانس باندھ لئے ہیں۔

وہ آکر بہت دور بے تعلق ہو کر بیٹھ جاتے قدسیہ خالہ بھی انجان بنی بار بار ڈوپٹہ سنبھالتیں۔ وہ اور بھی مچلتا گریبان کے سونے کے بٹن بوجھل ہو کر دھننے لگتے۔ اب انہیں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے آنکھیں استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

پھر وہ ہم میں سے کسی کو اکساتیں "شبیر ماموں سے کہو سرکار مدینے والے"

سنائیں۔

ہمیں "سرکار مدینے والے" سے زیادہ آنکھوں کا تھا قصہ چھری دل پہ چل گئی" زیادہ پسند تھا۔

مگر خالہ کو خوش کرنے کے لئے شبیر ماموں کے پیچھے پڑ جاتے۔

"ادھر بٹھاؤ مونڈھے پر" وہ شہ دیتیں۔ اور ہم انہیں لا کر مونڈھے پر بٹھا دیتے۔

وہ سنانا شروع کرتے تو ہم بور ہو کر جانا چاہتے مگر خالہ ہمیں پکڑ لیتیں چپکے سے کان میں گاجر کے حلوے اور مونگ کی دال کی پنڈلیوں کی رشوت کا حوالہ دے کر وہ ہمیں مجبور کر دیتیں۔ جیسے ان کے دل میں کوئی چور تھا۔ اکیلی ان کے پاس بیٹھتے ڈرتی تھیں ہم ساتھ ہوتے تو موقع اچھا ملتا تھا دونوں نہ جانے کیا ایک دوسرے سے کہتے اپنے کچھ پلے نہ پڑتا۔ نہ جانے کس بات پر قدسیہ خالہ ہنسنے لگتیں اور ہنسے جاتیں۔ ہم بھی ساتھ ہنسنے لگتے بچوں کو ہنسنے کے لئے وجہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خالہ کا رنگ نکھر آتا اور پھولوں بھری بالیاں گالوں کو چومتیں سب کو ہنستا دیکھ کر شبیر ماموں کی آنکھوں میں بھی موتی بھر جاتے بے رونق ہونٹ جاگ پڑتے۔

"خماں خاں ہی کو ہنس رہی ہو پگلی!" وہ اتنے چپکے سے منہ ہی منہ میں کہتے مگر خالہ سن لیتیں۔

"آپ چاہتے ہیں سدا روتی ہی رہوں"

"نہیں قدسیہ! میں ..... میں تو چاہتا ہوں ....." وہ ہکلانے لگتے۔

"کسے چاہتے ہیں؟" قدسیہ خالہ ان کی بات بیچ سے لپک لیتیں۔ اور اپنے مطلب کی بنا لیتیں۔

"قدسیہ ..... بڑبڑ ماموں نہ جانے کیا کہتے خاک سمجھ میں نہ آتا۔

"ہم احمقوں کی طرح منہ تکتے۔

"بڑبڑ ..... "قدسیہ خالہ نہ جانے کیا کہتیں۔ اپنی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر اتنا اندازہ ہو جاتا کہ نہایت میٹھی اور پیاری پیاری' باتیں ہو رہی ہوں گی۔ انکے چہروں کے تاثر سے ہمارے دلوں میں بھی لڈو پھوٹنے لگتے۔ بچے بہت سی ان کہی

باتوں کا مطلب سمجھ لیتے ہیں- محسوس کر لیتے ہیں- ہم کھلکھلا کر ہنستے انہیں آڑ
ل جاتی-

جھوٹے! کھایئے میری جان کی قسم!"

"کوئی اپنی جان کی قسم کیسے کھائے!" وہ اتنے ہولے سے کہتے کہ بہری بھنڈ
نانی بیوی خاک نہ سن پاتیں- دادی اماں کا مورچہ ذرا پرے کر تھا-

فریقین میں آج کل زور کی چل رہی تھی- دادی اماں نے مجلس کی مٹھائی
بھجوائی-

"نگوڑی قلتین ہو گی"-

نانی بیوی کہتی تھیں شیعہ تھوک اور غلاظت ملا دیتے ہیں- انہوں نے سب
کے سامنے تلتیوں کے لڈو بطخوں کو ڈگا دیئے- دادی اماں خون کے گھونٹ پی کے
رہ گئیں- مگر جب نانی بیوی نے سہارن پور سے آئی ہوئی پارسل میں سے انہیں
لوکاٹ بھجوائے تو انہوں نے فوراً مہترانی کو دیدئے-

"اری بہو دھولیجیو"- انہوں نے نانی بیوی کو جلانے کیلئے باآواز بلند مہترانی کو
رائے دی-

پھر نہ جانے قدسیہ خالہ کیا لورتیں فضا مکدر ہو جاتی- خالہ آنکھوں میں
آنکھیں ڈالنے پر مصر ہوتیں- شبیر ماموں مجرموں کی طرح فرش کی اینٹوں کو اس
انہماک سے گھورتے جیسے ذرا نظر چوکی تو وہ اچھل کر بھاگنے لگیں گی-

شام ہو جاتی شبیر ماموں اٹھ کر چلے بھی جاتے مگر خالہ کی آنکھوں میں روشن
شمعیں جگمگاتی رہتیں-- ہونٹ مسکراتے رہتے- جیسے کبھی بوا بانلے میاں کو دیکھ کر
آپ ہی آپ بڑے ناز و انداز سے مسکرایا کرتی تھیں- جب ان کی بانلے میاں سے
ان بن نہیں ہوئی تھی- مگر اب تو بوا کی آنکھیں خالی ہو چکی تھیں جیسے بنا تیل کے
بتیاں دھواں دے رہی ہوں- عجب باسی پن چھایا رہتا- عاج ہوئے کافی عرصہ ہو
چکا تھا مگر معلوم ہوتا تھا حکیم صاحب قبلہ کی گولیاں انکے معدہ میں چپک گئی تھیں-
آئے دن پیٹ خراب رہتا- کھٹی ڈکاریں آیا کرتیں-

بوا جو کبھی چڑیا کی زبان اور روٹی کو پھوا کھایا کرتی تھیں اب بھر بھر رکابی مکئی
کا بھات اور ارہر کی دال کھاتیں- اور دن بھر کھٹی ڈکاریں لیا کرتیں تھیں- نیند کا

جیسے مرض ہو گیا تھا- جب دیکھو جب منہ کھلا ہے کسی چیز کا سہارا لئے چپ چپ سو
رہی ہیں-

"جب پاگل تھیں تو نیند نہیں آتی تھی- اب تو مزے سے ہر وقت اونگھتی
تھیں- ہوشیار بھی خاصی ہو گئی تھیں- روز کرایہ داروں سے جا کے دنگا کرتیں-

"حرامجادے کراوا نا ہیں دیت ہیں! ہر کوئی ہم کا لوٹنے کی بھتا میں رہت
ہے"-

بوا نے ہوش آتے ہی دیکھا دنیا لیٹروں اور چوروں سے بھری پڑی ہے- جیسے
ان کی آنکھوں میں کسی نے جادو کی سلائی پھیر دی ہو- چودہ طبق روشن ہو گئے-
مکان چو رہا ہے- مگر مرمت کس سے کرادیں راج مزدور چور ہوتے ہیں- مونڈ کے
رکھ دیں گے-

کڑوں کے بعد شیر کے منہ والی ہنسلی بھی گڑھوالی اور فوراً اماں کے پاس لا کر
لوہے کے سیف میں رکھوا دی- پھر بھی اطمینان نہ ہوتا تھا- ہر وقت کڑے ہنسلی کی
خیریت پوچھتیں-

بھائی تالا تو ٹھیک سے رکھی ہے"-

کہیں آس پاس چوری ہو جاتی تو بوا پر قیامت ٹوٹ پڑتی- فوراً اماں سے سیف
کھلوا کر اطمینان کرتیں ہمیں اب وہ اپنی پیاری بوا نہیں دوسرے بے وقوف
عورتوں کی طرح لگتی تھیں-

پرانے تعلقات بالکل ذہن سے اتر گئے تھے- اب انہیں مصالحہ پیسے چولہا
جھونکتے دیکھ کے چڑ سی آتی-

اب تو ہم ان کے ساتھ سونے کی ضد بھی حماقت سمجھتے تھے- ان میں تازہ
کھدی مٹی کی سوندھی مہک کے بجائے لہسن' پیاز اور باسی کھانوں کی سڑاند آتی
تھی-

قدسیہ خالہ اور کھل گئیں-

نانی بیوی سر گئیں پیر آئیں مگر انہوں نے دوا نہ پی اور کھلے بندوں شبیر ماموں
سے میر کا کلام پڑھنے میں مدد لینے لگیں-

شام ہوتی- عصر کی نماز کے بعد جیسے ہی قدسیہ خالہ بائیں طرف سلام

پھیرتیں- طلسمی دیو کی طرح شبیر ماموں صدر دروازے پر نمودار ہو جاتے-

"وہ سمجھاتے اور خالہ سمجھتیں- دونوں کی آنکھیں جھکی رہتیں- چہرے اجنبی بنے رہتے- کبھی لمحہ بھر کو آنکھیں جڑ جاتیں- تو ہمارے دلوں میں بے سمجھے بوجھے ہل چل سی مچ جاتی جیسے آسمان پر رنگ برنگی پتنگوں میں پیچ پڑ گئے ہوں-

جب ہم بچے سمجھنے لگے تو نانی بیوی تو ایک خرانٹ تھیں-

ادھر سے دادی اماں کی معنی خیز ناقدانہ مسکراہٹیں-

"اے ہے- کچھ ایسی ویسی ہو جائے تو ناک تو صاحب خانہ کی کٹتی ہے"-

وہ بدبو دار پچھائی سے پیر دبواتے وقت اسے باریک باریک فلسفہ کے نکات سمجھایا کرتی تھیں- بالکل جیسے عام سیاست پر تنقید ہو رہی ہے- کسی کی طرف اشارہ ہو تو خدا کی پھٹکار- ویسے اگر کہیں پانی مرتا ہو تو وہ کیا کریں-

"نانی بیوی سنتیں اور پھڑپھڑاتیں-

"اللہ ذری املی توڑ دیجئے- چٹنی پسوائیں گے"- قدسیہ خالہ گریبان کے بٹنوں سے کھیل رہی تھیں-

"شبیر ماموں آ کر بیٹھے ہی تھے-

"کاہے سے توڑوں؟ کوئی بانس وانس!"

"اوئی! ماشاء اللہ آپ کیا کسی بانس سے کم ہیں- ذری ہاتھ بڑھا کر توڑ لیجئے-"

ایک پل کیلئے شبیر ماموں کی آنکھوں میں کوندا سا لپکا.....

ایسا لگا وہ زندہ ہیں اور اگر آس پاس کوئی نہ ہوتا تو یقیناً وہی حرکت کیا کرتے جو منجھولی کا منگیتر اسے اکیلے دوکیلے دیکھ کر کیا کرتا تھا.....

کالے دیو نے قدسیہ خالہ کی گردن کاٹ کے سرہانے کی چھڑی پائنتی اور پائنتی کی سرہانے رکھ دی تھی- ان کی گردن سے لعل ٹپک ٹپک کر شبیر ماموں کی جھولی میں گر رہے تھے- مگر وہ بے بس تھے کیونکہ دیو نے جادو کی چھڑی تھما کر انہیں مکھی بنا دیا تھا' اگر ان میں اتنی سکت ہوتی- اور وہ آگے بڑھ کے پائنتی کی چھڑی سرہانے رکھ دیتے تو قدسیہ خالہ کا کٹا ہوا سر فوراً جڑ جاتا-

شبیر ماموں کے جانے کے بعد نانی بیوی نے قدسیہ کو ان کی شوخی پر پھٹکارا-

"تو کیا میں نے کوئی چھنالا کر لیا"-

وہ ایک دم پھنکار کے اٹھ بیٹھی-

"ہے ہے نامراد لوگ کیا کہیں گے- مانا کہ شبیر بڑا شریف بچہ ہے- غیر نہیں رشتہ میں دیور ہوتا ہے- مگر یہ دنیا بڑی تھڑدلی ہے- بات کا بتنگڑ بنتے دیر نہیں لگتی میری بانو"-

"جوتی پہ واروں اس دنیا کو- دس برس سے جو اتا مرگ مجھے رلا رہا ہے- اسے دنیا کچھ نہیں کہتی"-

"سچ ہے لڑکیوں کو الٹی سلٹی کتابیں نہیں پڑھانی چاہئیں زمانہ بھر کا بس بھرا ہوتا ہے-

"بیٹی وہ مرد ذات ہے- اس کا کوئی بگاڑ کیا سکتا ہے- عورت کی عزت نازک آئینہ ہوتی ہے- ایک دفعہ بال پڑ گیا تو ساری عمر کو منہ ٹیڑھا ہی دکھائی دے گا"-

"اونہہ"

قدسیہ خالہ لاجواب ہو کر اپنی قمیض سے میچ کرتی چوڑیاں ڈبہ میں سے چھانٹ کر پہننے لگتیں-

"میرے تو گردھر گوپال..... دوسرا نہ کوئی....." وہ گنگنانے لگیں-

"اب تو بیل پھیل گئی' کیا کرے گا کوئی"-

"میرے تو....."

"اے بیٹی تم سے کتنی دفعہ کہا کہ یہ موئے کافرانہ گیت نہ الاپا کرو- گناہ ہوتا ہے- ظہر کی نماز بھی کھا گئیں- کتنا کتنا جگایا مگر پڑی اینڈتی رہیں- رت جگے ہونگے تو دن کو چمگادڑوں کی طرح پڑ کے سوؤ گی"-

"وہ تنک کر اٹھیں کہ ڈوپٹہ زمین پر لوٹ گیا- اور گریبان کے بٹنوں کے گھنگرو بج اٹھے- لوٹا لے کر چوکی پر وضو کو بیٹھ گئیں-

"نانی بیوی کیا سب بھلی بیویوں کو تن تن کے چلنے والی لڑکیوں سے چڑ تھی- شریف بچیاں رسان رسان ادب سے چلتی ہیں- قدسیہ خالہ کی نئی نئی پھرتی دیکھ کر نانی بیوی کو جھٹکے سے لگتے تھے-

"اے بی یہ کیا چال ہے- جیسے لقا کبوتری- اگایا بچھایا باہر کو نکلا پڑتا ہے"-

قدسیہ خالہ کے منہ لگنا- اپنی جوتی اپنے سر مارنا ہے- انہوں نے اماں سے

مسکوت کی۔

"یہ شبیر موا جان کے پیچھے اچھا لگا ہے۔ کتنی دفعہ تم میں ٹوک چکی ہوں۔ مگر جانو وہ بھی قدسیہ کی شہ پا کر ڈھٹائی پر تل گیا ہے۔ مجھے تو خلجان ہوا جاتا ہے"۔

"اے بی تمہیں تو خبط ہو گیا ہے اور کچھ نہیں تو شبیر نگوڑے پر شک آنے لگے۔ دو گھڑی دکھیا ہنس بول لیتی ہے۔ جینے کا کوئی بہانہ چاہئے"۔ اماں اچھے موڈ میں ہوتیں تو نانی بیوی ٹوٹنے لگتیں۔

"اے خاک پڑے ایسے جینے پر۔ کیا ارادے ہیں؟ تم بھی بمن کے نسوے دیکھ کے پھسلی جاؤ ہو"۔

"میں کہوں اگر ایسا ہو جائے تو کیا برائی ہے"۔ اماں نے ٹھنکتے ہوئے کہا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا"۔

"مچھو کہہ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست وکیل سے مشورہ کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں....."

چچا میاں کا نام مستقیم تھا۔ مگر پیار میں مچھو کہلاتے تھے۔ مستقیم کے معنی ہیں سیدھا۔ مگر چچا میاں کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ انتہا سے زیادہ اینگنے بینگے تھے۔

"آگ لگے خدائی خوار کے منہ میں۔ رنڈیوں کے ٹکڑوں پہ پلنے والا موا بھڑوا"۔

نانی بیوی نے چچا میاں کی قبر کھود ڈالی۔ وہ نہایت زندہ مونڈھے پہ بیٹھے قدسیہ خالہ سے سر میں تیل لگوا رہے تھے۔

"اے ہے میں کہوں....." اماں ہکلائیں۔

"خبردار جو تم نے اس معاملہ میں زبان کھولی۔ کیا بہنا کو دوسرا خصم کراؤ گی؟"

"اے غارت ہو"۔ ہمیں غور سے اس قدر راز کی باتیں سنتے پا کر اماں نے ایک دموکا جڑا۔

قدسیہ خالہ ان باتوں سے بے خبر چچا میاں کے کچھ پوچھنے پر شرما رہی تھیں۔ ان کے سفید گال تمتما کر گلابی دوپٹے میں ڈوبے جا رہے تھے کہ ٹاٹ کا پردہ سرکا۔ اور شبیر ماموں غوطہ مار کے اندر آئے۔ وہ ہر دروازہ سے اپنا سر بچانے کیلئے سر نیہوڑا لیا کرتے تھے۔

فضا ایک دم سانس روک کے تھم گئی۔ اماں نے اپنا بڑے پائنچوں کا پاجامہ تہہ کر کے کمر میں اڑسا۔ اور رام جھول چھنکاتی چلیں۔ ابا کی ٹم ٹم کی گھنٹی کی آواز دور ہی سے آ جاتی تھی۔ وہ کلب سے لوٹ کر باہری زینہ سے اوپر چلے جاتے۔ بالکل میر قافلہ کی طرح وہ سب سے الگ تھلگ سکون سے اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ اماں چھن چھن کرتی اپنا پنڈ چھڑا کے پتی سیوا کرنے چلی گئیں۔ اور نانی بی نے مورچہ سنبھالا۔

چچا میاں بھی عموماً ٹم ٹم کی گھنٹی سن کر سرک لیا کرتے تھے۔ گمبھیر طبیعت والے بڑے بھائی سے ان کی روح فنا ہوتی تھی۔ حتی الامکان کنی کاٹ جاتے کہ کہیں کسی بات کی پوچھ گچھ کیلئے طلبی نہ ہو جائے۔ باتیں وہ ایسی کرتے تھے کہ پوچھ گچھ کے جھمیلے میں نہ پڑنے ہی میں خیر و عافیت تھی۔

شبیر ماموں نے کتابوں کا بنڈل پلنگ پر رکھتے رکھتے کچھ منہ ہی منہ میں کہا۔ قدسیہ خالہ نے پھس سے کچھ جواب دیا اور وہ وادی اماں کو سلام کرنے ان کے برآمدے میں چلے گئے۔

نانی بیوی ان کی تاک میں ایسے بیٹھی تھیں۔ جیسے چوہے کیلئے بلی۔ جیسے ہی وہ برآمدے میں سے غوطہ مار کے نکلے انہوں نے دبوچ لیا۔

"قدسیہ خالہ کچھ جھینپی سی ابا کیلئے کھانا اتروانے باورچی خانہ کی طرف چلی گئیں۔ کھانے کے خوان چنے جا رہے تھے۔ وہ یہ سوچ کے کہ اماں بھی کوئی خوشگوار راز کی باتیں شبیر سے کر رہی ہونگی آپ ہی آپ گنگنا رہی تھیں۔

"ڈھول مزہ کر آ گیا تھا۔ وہ چوکی پر بیٹھ کر کڑیاں چڑھانے لگیں۔ بوا اکتائی سی دیوار سے لگی بیٹھی ایک طرف کو تھوک رہی تھیں۔ شاید املتاس کے مزے کو تھوکنا چاہتی تھیں۔ ہر وقت جہاں بیٹھتیں تھوکے جاتیں۔

"اچھی بوا ذری وہ نوٹنکی والے کی ٹنکری بتاؤ نا۔ نگوڑا کیسے تھاپ مارتا تھا"۔

بوا نے ایک دفعہ ڈھول کو ایسے دیکھا جیسے پوچھتی ہوں "یہ کیا بلا ہے؟" پھر منہ پھیر کر تھوک دیا۔

"ہائے بوا تمہیں بالے میاں کی قسم!" انہوں نے ڈھول سرکا کر بوا کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ پھر ایک دم چھوڑ دیا۔

"ہائے بوا تمہیں تو بخار ہے"۔

"ان کا ماتھا چھوا تو جل رہا تھا۔

"کئی دن سے نانی بیوی چلا رہی تھیں کہ بوا نے میرا برآمدہ گھکا کے رکھ دیا ہے۔ ناک نہیں دی جاتی۔ اے بھئی ان سے کہو اپنے گھر جا کے رہویں۔ کرائے دار تو بھاگ گیا۔ دونوں وقت کھانا یہاں سے پہنچا دیا جائے گا"۔

انہوں نے اماں کو چڑھایا ان کی دل چسپی بھی اب بوا میں ختم ہو چکی تھی۔ جو کچھ ہو سکتا تھا سب نے ان کی بھلائی کیلئے کیا ابا پنشن کی فکر میں کفایت شعاری پر ہر وقت زور دیتے۔ اس مہمان نوازی نے تو پست کر ڈالا تھا۔ ہر موسم ہر تہوار ہر بہانے سے مہمان آن دھمکتے۔۔ پر تکلف کھانے پکتے۔ موسم اور تہوار کے اعتبار سے جڑاول یا گرمی کے کپڑے بنوائے جاتے۔ مہمان بد ہضمی سے بال بال بچ کر تحفے سمیٹ کر رخصت ہوتے تاکہ نئے مہمانوں کیلئے چارپائیاں خالی کر سکیں۔

بوا کا مستقبل کافی سنوار دیا گیا تھا۔ جی اچھا نہیں رہتا تھا تو اس میں کسی کا کیا قصور۔ الا بلا زہر مار کر لیتی تھیں۔ ان کی چمارن سے عرصہ ہوا پیچھا چھوٹ چکا تھا۔ وہ ایک دن آئی بھی، دیر تک بیٹھی ان کے پیر دباتی رہی۔ ان کی درگت پر آنسو بہاتی رہی۔ مگر پھر ڈانٹ کے بھگا دی گئی۔ اور پیپل کے پیڑ نیچے رہنے لگی تھیں۔ بھیک سے گذر ہو جاتی ہوگی۔

"مگر اب مجبوری تھی۔

"عرس کے موقع پر منجھو مع اپنے سسرال والوں کے آ رہی تھی۔

"اس کی ساس بہو کی گود ہری ہونے کیلئے منت ماننے آنا چاہتی تھیں اس لئے بوا عارضی طور پر اپنے گھر چلی گئیں۔ ان کی لاڈلی چمارن پھر برآمدے میں آ کے ڈٹ گئی۔ تین وقت چائے اور کھانا سینی میں لگ کر چلا جاتا۔ جی اچھا ہوتا تو وہ خود آ جاتیں۔ کبھی کئی کئی دن پڑی رہتیں۔ نانی بیوی کے برآمدے میں جب سے قلعی ہوئی تھی وہ بہت محتاط ہو گئی تھیں۔ اتنی صاف جگہ اب بوا کو اٹھتے بیٹھتے بھی ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ پہلے آیا کرتی تھیں تو گھر کی بیوی سے زیادہ اجلے کپڑے ہوتے تھے تو ساتھ بیٹھتی تھیں پھر میلی ہونے لگیں۔ تو ان کے آتے ہی سامنے پیڑھی یا پیڑھا سرکا دیا جاتا اور وہ بیٹھ جاتیں۔ پیڑھی نہ ہوتی تو دہلیز پر بیٹھتیں ..... مترانی،

دھوبن اور دوسری نچ عورتوں کی طرح۔

دادی اماں کسی کا جھول نہیں پالتی تھیں۔ ان کے پاس جاؤ تو جی گھبرانے لگتا تھا۔ ہر وقت ہوں ہوں" کا ہمتی رہتی تھیں۔

"کبھی رات کو جانے کی سکت نہ ہوتی تو بھینس کے چھپر میں آدھی کھٹیا اندر آدھی باہر ڈال کر پڑ رہتیں۔ گوبر اور مرغیوں کی بیٹ کی بدبو میں بوا کی بدبو دب جاتی تھی۔

شبیر ماموں جو اس دن نانی بیوی سے بات کر کے گئے تو جیسے غائب ہی ہو گئے۔ قدسیہ خالہ بورائی ہو کر ٹہلتیں۔ سونے کی تو انہوں نے قسم ہی کھا لی۔ جب دیکھو کروٹیں بدل رہی ہیں۔ مارے فکر کے نانی بیوی گھلی جاتی تھیں۔

"منجھلی کا پھر نصیبہ جاگنے والا ہو رہا تھا۔ اس کی ہونے والی خلیا ساس اور دیورانی بارہ بنکی سے آئی ہوئی تھیں۔ اور خاطریں وصول کر رہی تھیں۔

"اے، انہی کے میاں نے میم ڈال لی ہے"۔ ہونے والی دیورانی نے بڑے تاسف سے پوچھا۔

قدسیہ خالہ پہلی بار بانچھے فخریہ نڈھال ہونے کے نہایت بھونڈے پن سے ہنسیں "ہاں بہن ..... میم ہے ہماری سوتن! پر سنا ہے تمہارے میاں نے تو تیلن ڈال لی ہے"۔

بات درست تھی مگر بلی کے گو کی طرح چھپائی جاتی تھی دیورانی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

وہ چلی گئیں تو پتہ چلا لڑکا ذرا کانا ہے۔

مگر سب کو یقین تھا کہ یہ والی اڑچن منجھو کی شادی میں قدسیہ نے ڈالی۔ حکیم صاحب قبلہ سے قدسیہ خالہ کی صحت کے بارے میں رجوع کیا گیا تو انہوں نے وہی سوداوی مادے کی افراط تشخیص کی اور وہی نامراد املتاس والا نسخہ، خون کی حدت کا واحد علاج!

نانی بیوی نے قدسیہ خالہ کی ایک نہ سنی۔ اور اپنے برآمدے میں اینٹوں کا چولہا جما کے اپنے ہاتھ سے تریاق تیار کیا۔

"بیٹی اللہ شافی اللہ کافی کہہ کے پی جاؤ"۔ نانی بیوی نے انہیں بادیہ تھما کے

پیٹھ سہلائی۔

قدسیہ خالہ نے بڑے اطمینان سے بادبہ موری میں ٹھیک اس جگہ پھینکا۔ جہاں ایک دن بوا نے پھینکا تھا۔

"اللہ کی مار ہو تجھ پر ..... یہ کیا کر رہی ہے"۔ نانی بیوی چلائیں مگر خالہ بڑے اطمینان سے ڈھول اتار کر اس پر وہ بول نکالنے لگیں جو حال ہی میں میترانی سے سیکھے تھے۔

نانی بیوی نے جل کے ڈھول چھینا تو وہ زور سے جھٹکا ان کا ہاتھ کہ بڑی بی گرتے گرتے بچیں۔

"تمہارے اوپر بوجھ بن گئی ہوں تو مجھے زندہ دفن کرا دو' کتے کی موت کیوں مارنا چاہتی ہو۔ میں یہ زہر نہیں پیوں گی ہرگز نہیں پیوں گی"۔

آج ہی انہیں پتہ چلا تھا کہ اس دن شبیر میاں کو نانی میاں نے بڑے سلیقہ سے آنے کو منع کیا تھا۔

"تم تو اسے بہن سمجھتے ہو' میاں! مگر دنیا بڑی ظالم ہے....."

انہوں نے سمجھایا تھا۔ اور شبیر میاں سمجھ گئے تھے۔

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے مردار!"

"ہاں دماغ خراب نہ ہو گا تو اور کیا ہو گا۔ انسان ہوں پتھر نہیں۔ پندرہ برس کی عمر میں مجھے بھاڑ میں جھونک دیا۔ سہاگ کی مہندی بھی پھیکی نہ پڑی تھی کہ سات سمندر پار چلا گیا۔ وہاں اسے سفید ناگن ڈس گئی۔ پر یہ تو بتاؤ میں نے کیا قصور کیا تھا۔ کسی سے دیدے لڑائے تھے۔ کسی سے یاری کی تھی؟"

"تیرے پھوٹے نصیب بیٹی۔ خدا کی مرضی میں کس کو دخل ہے"۔

"میں نے خدا کے حضور میں کونسی گستاخی کی تھی کہ مجھے یہ سزا ملی اور وہ کمینہ عیش کر رہا ہے"۔

"بدنصیب' شوہر کو کمینہ کہتے شرم نہیں آتی ..... وہ تیرا خدائے مجازی ہے"۔

"لعنت ہو اس کی صورت پر۔ لچا زمانے بھر کا"۔ قدسیہ خالہ اور بڑھیں۔

"اری کم بخت تجھے اپنے سہاگ کا بھی مان نہیں۔ اس نے کوئی گناہ تو نہیں

کیا۔ شرع میں چار نکاحوں کا حکم ہے۔ تم ہی ایک نرالی نہیں ہو بہو۔ ہزاروں پر پڑتی ہے۔ مگر شرافت سے جھیلتی ہیں۔ مرد کی ذات ہی بے وفا ہوتی ہے"۔

"لاجواب ہو کر قدسیہ خالہ خود کو کوسنے لگیں۔

"یا اللہ مجھے اٹھا لے اے پاک پروردگار میری مٹی عزیز کر لے کہ اس عذاب سے تو جان چھوٹے۔ یا اس مردود کو موت دے کہ میرا دم ہی چھوٹے اس نابکار سے"۔ "اری چڑیل یہ تو کسے کوس رہی ہے"۔ نانی بیوی کانپ اٹھیں۔ شوہر پھر شوہر ہوتا ہے۔

"باقر حسین تمہارے چہیتے داماد کو۔ حرامزادے کتیا کے جنے کو"۔ قدسیہ خالہ گئیں ہاتھ سے"۔ اسے دوزخ کی آگ جلائے قبر میں کیڑے پڑیں"۔ وہ دوپٹہ پھیلا کر جھوم جھوم کر کوسنے لگیں۔

"تو کیا دوسرا خصم کرے گی"۔

"ہاں کروں گی ..... کروں گی ....." نہیں یہ قدسیہ خالہ نہیں تھیں۔ کوئی بھتنی تھی۔ "تو جا کوٹھے پر کیوں نہیں بیٹھ جاتی"۔

"کوٹھے پر بھی بیٹھ جاؤں گی۔ دیکھتی ہوں کوئی میرا کیا کر لیتا ہے"۔

قدسیہ خالہ کوٹھے پر بیٹھنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھیں غصہ میں بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ نانی بی خوب نانا میاں کو یاد کر کے روئیں۔ جس دن سے شبیر ماموں نے آنا بند کیا تھا۔ ماں بیٹی میں یہ تو تو میں میں روز ہوا کرتی۔ قدسیہ خالہ کی سسرال تک بات پہنچ گئی۔ ان کے سسر بہت کبیدہ خاطر ہوئے۔

"اماں نے لاڈ میں دماغ خراب کیا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو بہو بیگم خاندان کی ناک کٹوائیں گی۔ بہتر ہے انہیں یہاں بلایا جائے عقل درست ہو جائے گی"۔

"نانی بیوی بھی بھیجنے کو تیار ہو گئیں۔ اب وہ ان کے قابو کی نہ تھیں۔

"ہاں بھئی وہ جانیں اور ان کی بہو۔ میں کہاں تک مغز ماری کروں"۔ نانی بیوی نے فیصلہ کیا۔ مگر سسرال کے بلاوے کا ذکر سن کے قدسیہ خالہ بالکل بکھر گئیں۔ "بیٹے کو کچھ نہیں کہتا مکار کہیں کا۔ آگ لگے اس کی داڑھی میں۔ جھل لگے اس کی صورت کو"

"ارے بدبخت تیرا ماموں ہے!" نانی بیوی چلائیں۔

"تھو ہے ایسے ماموں کے جنم میں۔ پھوٹے منہ سے اپنے بیٹے سے نہ کہا گیا کچھ! ارے وہ تو بڑے خوش ہیں۔ میم آتی ہے تو للو چپو کرتے ہیں۔ چھری کانٹے سے میز کرسی پر ڈنر کھاتے ہیں بیٹے کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں نا! اس لئے میم کے سامنے کتے کی طرح دم ہلاتے ہیں۔ بس وہ میم ہی تو انہیں بخشوائے گی! اسی کا سایہ پکڑ کر جنت ملے گی"۔

"کیسے جائے گی مردی؟ اے خدا اس ناہنجار کا پردہ ڈھک جائے۔ آگ لگے تیری زبان کو"۔ انہوں نے جوتی سنبھال قدسیہ خالہ کے ہونٹ کچل دیئے۔

پھر تو بس ان پر جیسے مرگھٹ کی بھتنی سوار ہو گئی۔

دانت کچکچا کر انہوں نے نانی بیوی کی دونوں سینک سلائی جیسی کلائیاں مروڑ کے رکھ دیں۔

ایک پل کو نانی بیوی نے ان کی بپھری ہوئی آنکھوں میں دیکھا ..... اور ان کا کلیجہ سن سے رہ گیا۔ وہاں انکی عزیز از جاں بیٹی قدسیہ بانو نہیں تھی۔ چوٹ کھائی شیرنی تھی کہ پھن کچلی ناگن! جس کی آہنی گرفت میں ان کی جان کھنچنے لگی۔ لرز کے بڑی بی دوہری ہو گئیں۔ "ہائیں ہائیں" کہہ کے سب دوڑ پڑے۔ شکاری کتوں میں گھری ہوئی ہرنی کی طرح وہ سر پیر سے لرزنے لگیں۔

"ہائے یہ کیا کیا قدسیہ بندی تو نے؟ اماں بی کے اور تیرا ہاتھ اٹھا"۔

"ہر طرح بے بس ہو کر انہوں نے دونوں ہاتھ چبوتری پر پڑی ہوئی سل پر دے مارے۔ چوڑیاں چکنا چور ہو گئیں۔

"اے ہے لوگو کیا ہو رہا ہے؟" بہری دادی اماں کا دم گھٹ رہا تھا۔ "اے لڑکیو ذرا چراغ کی لو تو اکساؤ ..... کیا ہو رہا ہے؟" لالٹینیں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ مگر دادی اماں کا اندھیرا کون دور کر سکتا تھا۔ اندر باہر کھلبلی پڑ گئی۔ سارے نوکر' ٹھٹ لگا کے صدر دروازے کے پاس جمع ہو گئے۔ چاروں طرف سے بیویاں پائنچے سنبھالتی دوڑیں بچے بسورنے لگے۔ مرغیاں کڑکڑانے لگیں۔

"خبردار جو کسی نے مجھے ہاتھ بھی لگایا۔ قرآن پاک کی قسم سر پھاڑ دوں گی"۔ قدسیہ خالہ نے سل کا بٹہ سر سے اونچا اٹھایا۔ سب کو اپنی جان پیاری تھی۔ سب

ہائے توبہ مچاتی رہیں۔ آگے بڑھنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ قدسیہ خالہ نے بٹہ پٹک کر پا بے پا شیشہ بلور توڑنا شروع کیا۔ اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھ ہونٹوں تک پہنچتے۔ شبیر ماموں نے بڑے اطمینان سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"دس برس بعد کسی مرد نے انہیں ہاتھ لگایا! ان کے ہاتھ بے بس ہو کر نیچے گر گئے۔ مڑ کر انہوں نے شبیر حسن کی آنکھوں میں دیکھا اس وقت تو وہ بہشت بریں سے بھی لوٹ آتیں۔ آنکھیں موند کر وہ تیورا کر ان کے سینے پر گریں۔

"ایک لمحہ کو شبیر حسن کے ناکارہ ہاتھ ٹھٹکے۔ پھر انہوں نے سب کے سامنے خالہ کو اتنی زور سے بھینچا کہ انکی پسلیاں کڑکڑا گئیں۔ سارے کنبہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ہم لوگ اکڑی ڈکڑی چھوڑ منہ پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ ایک دم فضا نے دم سادھ لیا۔ نانی بیوی ٹوٹے چھپر کی طرح ڈھے گئیں۔

"کیا ہو رہا ہے لوگو! ..... یہ چپکا کیوں پڑ گیا ....." "دادی اماں سجدہ گاہ ٹٹول کے تکیہ کے نیچے سے نکالنے لگیں۔

"کیا سب نے نیت باندھ لی کہ کوئی نہیں بولتا"۔

"شبیر حسن نے ان کا نحیف و زار جسم دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔

ایسا لگا اب وہ کبھی ان ہاتھوں سے انہیں دور نہ ہونے دیں گے۔ اسی طرح انہیں اٹھائے چلے جائیں گے۔ کسی میں زور سے سانس لینے کی ہمت بھی نہ تھی۔ انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر ہولے سے قدسیہ خالہ کو پلنگ پر ڈال دیا اور بے تعلق دور کھڑے ہو کر فرش گھورنے لگے۔ جیسے کہتے ہوں۔

"لو بھئی یہ پڑی ہیں قدسیہ بانو! اس وقت بے ہوش ہیں۔ اچھا موقع ہے چپکے سے کوئی آؤ۔ اور گلا گھونٹ دو ..... رنجھا رنجھا کے نہ مارو"۔

حکیم صاحب قبلہ نے فوراً نبض دیکھ کر کہہ دیا کہ سر کو گرمی چڑھ گئی۔ صاحبزادی کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ اللہ پاک کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں۔

" بکتے ہیں بید جی"۔ بدبو دار پٹھانی نے لہنگا جھاڑتے ہوئے فیصلہ کیا۔ "ہمکار تو کچھ اور ہی دکھائی پڑت ہے"۔

"ہاں بھئی مجھے بھی ایسا لگے ہے جیسے بوا نگوڑی کا جن انہیں چھوڑ کے بچی پر پیش ہو گیا ہے۔ دیکھتی نہیں بہن چوں چوں بوا سدھرتی گئیں قدسیہ بانو کے طور

"بگڑنے لگے"۔ باقری پھپو نے نانی بیوی کو یقین دلایا۔ "غضب خدا کا چٹے کپڑے
پہن کے لاڈو عطر پھلیل لگا کے وقت بے وقت چمن میں ٹہل لگایا رکھتی ہیں"۔

ایک دم قدسیہ خالہ کی پوزیشن اونچی ہونے لگی۔ اب وہ اکیلی نہیں تھیں۔
جن بھوت، پریت یا کوئی پیر مرد بھی ان کے ساتھ تھے۔ ہماری اماں بیچاری فوراً ان
سے نہایت مرعوب ہو گئیں۔ اماں تو بس اللہ میاں کی گائے تھیں۔ ہر عقل میں نہ
آنے والی چیز سے احتیاطاً ڈرتی رہتی تھیں۔

پیر مرید، بھوت پریت اور جن، وہ کوئی بھی ہو وہ کسی سے الجھنا پسند نہیں کرتی
تھیں۔ وہ تو اس لئے سن نرائن کیلئے بھی چندہ دے دیتیں۔
پانچ ٹانگ کی گائے کو گھاس کھلواتیں۔ سانپوں کو دودھ پلواتیں۔

"بیٹی یہ کفر ہے"۔ نانی بیوی سمجھاتیں۔ "نذر نیاز کی اور بات ہے۔ مگر یہ سوئی
کتھا میں اپنی عاقبت نہ بگاڑو"۔

مگر اماں کو عاقبت سے زیادہ اپنا سہاگ اور بچے پیارے تھے۔

ارے بھئی کیا پتہ یہ دیوی دیوتا بگڑ کھڑے ہوں تو ان کا کوئی کیا بگاڑ لے گا۔
قبرستان سے لگا ہوا شمشان بھومی تھا بچے بے تحاشہ بیلوں کی طرح ہر طرف دندناتے
پھرتے۔ ایک دفعہ کسی مندر میں کچھ بھگوان کا اپمان کر آئے۔ مہنت جی دہائی دیتے
ہوئے آئے۔ اماں نے فوراً پرائشچت کیلئے بامن کھلوائے کہ دیوتا غصہ میں تختہ نہ
لوٹ دیں۔ مندر سے پرساد آتا تو سب بیویاں تھو تھو کر کے کہتیں "مرغیوں کو ڈالو'
نجس ہے"۔ مگر اماں طاق میں رکھ دیتیں۔ بچے فوراً ٹھکانے لگا دیتے۔ تب انہیں
اطمینان ہوتا۔ بچے تو پتھر بھی کھالیں تو ڈکار نہ لیں۔ اور بھئی کسی کو کیا پتہ شاید
پرساد میں برکت ہو۔

قدسیہ خالہ کی بھی وہ سیوا میں جٹ گئیں۔ ہر شخص کی بات سے اتفاق کر کے
جن بھی اتروائے بھوت پریت بھی منائے۔ پیروں کی نیازیں بھی دلوائیں ان کی بے
طرح خاطر کرنے لگیں۔ اس نئی قدسیہ سے انہیں وحشت ہوتی تھی۔ پاگل ہونے
کے سوال پر وہ بالکل نیوٹرل تھیں کون جانے پاگل بھی کسی قسم کی روحانی طاقت رکھتے
وہیں بال بچوں والی کو ہر طرف سے چوکنا رہنا چاہئے تاکہ زاویہ سے کسی قسم کے
خطرے کی گنجائش نہ رہے۔ اور جن لوگ تو بڑے ٹیڑھے مزاج کے ہوتے ہیں کہ

پاک پروردگار نے انسان کو ادنیٰ مٹی سے بنایا اور جنوں کو آتش سے آگ بھڑک گئی
تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ خالہ پر کوئی بھوت پریت نہیں جو انہیں کو اچھالنے کی
ترغیب دیتا۔ کوئی نہایت مہذب فیشن ایبل قسم کے بے حد شوقین مزاج پیر مرد کا
سایہ معلوم ہوتا تھا۔ قدسیہ خالہ کی ناز برداریاں دیکھ دیکھ کر ایک چچا میاں تھے جو
کلتے تھے انہیں بھی اللہ پاک نے دکھتی سے نہ سہی مگر بھوبل سے ضرور بنایا ہو گا۔

"قدسیہ بانو بڑی چنٹ ہو خوب سارے گھر کو الو بنا رہی ہو۔"

چچا میاں مسکراتے مگر سب جانتے تھے وہ نہایت ملحد مرتد اور نابکار قسم کے
انسان تھے۔ سب انہیں لعنت ملامت کرتے پیر مرد کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔"
وہ کفر بکتے اور نانی بیوی ماتھا کوٹ لیتیں۔

آگ لگے تیری زبان کو' وہ نگوڑی تن بدن کی سدھ کھو بیٹھی ہے اور تو ہے
کہ بکے جاوے ہے۔" وہ قدسیہ خالہ پر بے حد ماماتا توڑنے لگتی تھیں۔ بات بات پر
گلہ بھی لاتیں اور نانا میاں کو یاد کرنے لگتیں وہ زندہ ہوتے تو غریب کو تیری میری
سننا پڑتی وہ قدسیہ خالہ کے لئے فالسوں کا شربت بنانے لگتیں۔

"ارے ہم ان کے چلتر خوب سمجھتے ہیں شبیر میاں سے ملنے کا....."

قدسیہ خالہ بال سلجھاتے ان سے الجھ پڑتیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
مسکراتیں۔

"کیا مشتری جان نے جوتیاں مار کے نکال دیا۔" وہ چٹکی بھرتیں سب جانتے
تھے کہ چچا میاں رنڈیوں کی کمائی پر عیش کرتے تھے۔"

میرا ذکر چھوڑو..... تم اپنی کہو....."

"قدسیہ بیٹی ..." نانی بیوی انہیں شربت کا گلاس تھما کر ان کا رخ موڑ
دیتیں۔" اس کم ظرف کے منہ نہ لگا کر ہوا مور کا کیڑا سب کو اپنی طرح سمجھتا
ہے۔" نانی بیوی اچانک اس حادثہ کے بعد سے نہایت پرو قدسیہ ہو گئی تھیں۔

"صاحبزادی پر کسی نہایت جلالی پیر مرد کا سایہ ہے انہیں حتی الامکان اشتعال
نہ دلایا جائے۔" تایا ماں کے لکھنؤ والے مولانا نے فتویٰ دیا تھا۔ حکیم صاحب قبلہ

کی بھی ناچیز رائے تھی کہ فی الحال جلاب ملتوی رہیں۔ اس لئے جذبات کو بھڑکانے سے احتراز کیا جائے ورنہ سر پر اور گرمی چڑھے گی مگر کوئی چچا میاں کو کیسے سمجھائے۔ پاگل ہو کر تو قدسیہ خالہ کے عیش ہو گئے روئی کے گالوں پر پالی جانے لگیں بالکل شہزادیوں کی طرح صاف شفاف چادر کسی پلنگڑی پر نیم دراز سودا اور ذوق کے کلام سے لطف اندوز ہوا کرتیں شبیر حسن میٹھے میٹھے لہجہ میں شعر پڑھتے وہ انہیں بوکھلانے کے لئے کسی نازک سے شعر کے معنی پوچھ بیٹھتیں وہ پہلے کی طرح آنے لگے تھے اور اگر آنے میں دیر ہو جاتی تو قدسیہ خالہ اٹھک بیٹھک شروع کر دیتیں۔

چچا عام طور پر بدذاتی پر تل جاتے مگر اس دن تو وہ بڑھتے ہی چلے گئے۔ قدسیہ خالہ نے شربت کا گلاس ہونٹوں سے لگایا مگر گھونٹ نہ بھرا۔

"عجیب مخنچو ہیں یہ تمہارے شبیر حسن! ہم ہوتے تو......"

انہوں نے ہولے سے ایسے منہ ہی منہ میں کہا کہ نانی بیوی نہ سن پائیں

"تم ہوتے تو؟" قدسیہ خالہ نے دانت پیسے۔

"لے کے بھاگ جاتے!" چچا میاں نے لمبی چوڑی انگڑائی کے ہاتھ پھیلائے۔

"کمینے مجھے بھی کیا اپنی مشتری جان سمجھا ہے" قدسیہ خالہ ننگی تلوار بن گئیں۔

"ہر عورت میں کہیں نہ کہیں مشتری جان چھپی ہوتی ہے اور موقع پا کر۔"

قدسیہ خالہ نے شربت کا بھرا گلاس چچا کے منہ پر کھینچ مارا اور پیر سے ننھی سی سلیم شاہی جوتی گھسیٹ ان پر ٹوٹ پڑیں۔

اگر ہوش کھو کر یوں دونوں جہان کی بادشاہی مل جائے تو کون کم بخت ہوش میں آنا چاہے گا۔ پہلے اگر یہی قدسیہ بانو اونچی آواز سے بولتیں تو سب مام دھرنے لگتے آج وہ چھ فٹ تین انچ کے دیو ہیکل مردوے کی جوتیکاری کر رہی تھیں ایک سانس سو گالیاں دے رہی تھیں اور سب منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے تھے بلکہ عش عش کر رہے تھے۔ "ارے ارے نیک بخت میں تو مذاق کر رہا تھا۔" دونوں ہاتھوں سے وہ وار روک رہے تھے وہ چچا میاں جنہوں نے صدیق پہلوان کو مشتری جان کے پیچھے اٹھا کر چھ فٹ اونچی دیوار کے پار پھینک دیا تھا جیسے صدیق ہاتھی کا بچہ نہیں پھولوں کا گیند تھا وہ قدسیہ خالہ سے پٹ رہے تھے اس دن تو ہم سب بھی

قائل ہو گئے یہ دھان پان سی ٹھنکنا سی قدسیہ خالہ پہلوانی کے ہاتھ نہیں دکھا رہی تھیں۔ یہ تو وہ جن تھا جو ان پر عاشق تھا۔

اور جس پر جن مرتے ہوں اس سے کون الجھے؟

ایک لق و دق کوٹھی میں ہر کونہ ایک جدا صوبہ کی طرح بے تعلق ہو جاتا ہے۔ عرس کا زمانہ قریب آ رہا تھا۔ تیج تہوار کے علاوہ مہمانوں کے آنے کا بھی ایک حیلہ تھا۔

مہینوں پہلے سے دور دراز کے جان پہچان اور رشتہ دار آنے شروع ہو جاتے کوئی الگ کمرے غسل خانے تو دیئے نہیں جاتے کہ کچھ فرق پڑے بس چارپائیاں کھٹولے تخت اور بچھا دیئے جاتے۔ دستر خواں لمبا کر دیا جاتا۔ ایک رکابی میں دو دو کھانے لگتے قطعی کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ بس بھرے بازار کا سا ہلڑ مچا رہا جس میں بڑا مزا آتا۔ ننھیال ددھیال کے دو کیمپ حسب ضرورت چھوٹے گروہوں میں بٹ جاتے۔ عجب سماں ہوتا دادی اماں کی طرف زیادہ بڑھیاں سمٹ آتیں جن کے سامنے ہلو بھی تو اختلاج کے دورے پڑ جائیں نانی بیوی کے ہاں عموماً" اماں کی ہم عمر پھکڑ ہنسوڑ اور دنیا دار قسم کی بیویاں جمع ہو جائیں وہ جن کے دودھ پیتے بچے اور شور ساتھ ساتھ ہوتے بالکل الگ تھلگ دو دو پلنگ ڈال لیتے نو عمر لڑکیاں بالکل دوسری سمت ایک ایک پلنگ پر دو دو سوتیں باقی وقت ای ریوڑ کی صورت میں کانا پھوسی کیا کرتیں سپ مرغیاں کبوتر اور کتے بیچ صحن میں پیڑوں کے نیچے کھڑے پلنگوں اور چوکوں پر وند مچایا کرتے۔ ایک کونے میں کوئی حادثہ ہوتا تو عوام کو خبر ہوتے ہوتے کچھ وقفہ لگ جاتا۔ اسلئے چچا کی جوتے کاری کے بہت کم چشم دید گواہ تھے۔۔ جب تک بیویاں جوتے پہن کر پائینچے سنبھالتی آئیں بجلی کی سرعت سے ہونے والے حادثات کا نام و نشان بھی نہ ملتا تھا۔

جب سب جمع ہوئے تو قدسیہ خالہ دوپٹہ سے منہ چھپائے پھنکار رہی تھیں اور چچا میاں سرپٹ دروازے کی طرف ہنستے ہوئے جا رہے تھے جیسے انہیں جوتیاں نہیں بالو شاہیاں مل گئی ہوں۔"

اے لڑکیوں! کیا ہو رہا ہے بھئی ہمیں تو کوئی بتائے ہی نہیں ہے۔"

دادی اماں کراہیں۔ ان کے ساتھ کی تمام تھکی ہوئی بوڑھیوں نے کروٹ بدل

لئے اور پھر اونگھنے لگیں۔

"کیا ہوا' کیا بات ہوئی؟"

سب ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔

کسی کو پتہ نہیں تھا کہ بدبو دار پٹھانی اور اوپر کے کام کے چھوکرے میں ہاتھا پائی ہوئی تھی یا سانپ نکل آیا تھا۔

"کس نے مارا' کسے مارا؟" سب پھر ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے بچوں والیاں اپنے بچے گن رہی تھیں اماں سب باتوں سے بے نیاز پائنچے اڑس کے ابا کی ٹم ٹم کی گھنٹی کی آواز پر پیا ملن کے لئے جا رہی تھیں۔

"اے ہوتا کیا؟" میرا سر" نانی بیوی چشم دید گواہوں میں ہوتے ہوئے بھی پراسرار بن رہی تھیں ان کے منہ جو لگے گا وہ بھگتے گا۔" ان سے مراد قدسیہ بیگم ہرگز نہ ہوں گی۔ وہ غریب دھان پان! نگوڑی میں دم ہی کہاں تھا! ساری کرامات پیرو مرد کی تھی۔

بڑی اداس سی شام تھی آسمان پر باریک سی گرد و غبار کی چادر تنی ہوئی تھی۔ ابابیلیں قینچیوں کی طرح ہوا کو کترتی ہوئی سپاٹے بھر رہی تھیں۔ عرس میں شرکت کرنے والے قوالوں کی ٹولیاں آنے لگی تھیں لمبے چوڑے شامیانے کی دن بھر مرمت ہوا کرتی درگاہ تازہ قلعی کے بعد سفید براق ہو جاتی تھی جیسے کسی نے بہت سا سفید مارکین کھول کے اونچا نیچا ڈال دیا ہو۔

ان دنوں ہم گھر کو بھول کر درگاہ کے ہو رہتے تھے وعظ سے ہمیں رونا آنے لگتا تھا مگر قوالی میں خوب مزا آتا۔

سراجم منیرا نگار مدینہ تجلی مکہ بہار مدینہ

مطلب خاک پلے نہ پڑتا مکہ مدینہ کے ذکر سے ہم مرعوب ہو جاتے پھر کسی اللہ والے کو حال آ جاتا اور خوب اودھم مچتی۔ قوال ایک یہ شعر پر اٹک جاتے اور وہی دہرائے جاتے یہاں تک کہ بور ہو کر حال کھیلنے والا ست پڑ جاتا اور قوال نیا قطعہ شروع کرتے۔

"کیا ہوا لوگو ہمیں بھی تو بتاؤ۔" ہم اندر آئے تو دادی اماں منمنا رہی تھیں بوا کی چمارن سب کے پیر پڑتی پھر رہی تھی۔

"ارے کوئی چل کے دیکھو رام جانے ادکا کا ہوئی گوا۔"

"ہے ہے کسے۔"

"کیا ہو گیا؟" سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ اور جب معلوم ہوا کہ بوا کو تین چار دن سے بخار تھا کل رات کو نہ جانے کب نکل کھڑی ہوئیں۔ صبح قبرستان میں اوندھی پڑی ملیں تب سے گھانٹی چل رہی ہے۔

"ہے ہے نگوڑی!" بیویاں افسوس کرنے لگیں۔ پھر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئیں "ہم پوچھیں تو کوئی بتائے نہیں ہے کتا ہیں کہ بھونکا جاویں ہیں کیا مجال جو کوئی کان دھرے+" دادی اماں نے تکیہ تلے سے سجدہ گاہ نکالی اور نیت باندھ لی نانی بیوی ان کے نیت باندھنے کے انداز پر توبہ توبہ کرتی تھیں۔ سجدہ پر بھی اعتراض تھا جیسے مینڈکی ڈبکیاں کھا رہی ہو۔

ایک قدسیہ خالہ تھیں بے کل ہو رہی تھیں ہڑبڑائی ہوئی ادھر سے ادھر جا رہی تھیں۔ "اے ہے کوئی ڈاکٹر سے جا کے کہو۔"

درگاہ کے ہسپتال کے ڈاکٹر مفت علاج کرتا تھا کسی کو قدسیہ خالہ کی بلبلاہٹ پر تعجب نہ ہوا مگر ان کا حکم ٹالنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

رات بھر بوا کی گھانٹی چلتی رہی۔ ڈاکٹر نے کہا ڈبل نمونیہ ہے۔ صبح ہم لوگ بھی دور سے انہیں دیکھنے گئے عیادت کو نہیں یونہی۔ بوا چھپنگے میں پڑی ایڑیاں رگڑ رہی تھیں وہ بدبو تھی کہ ناک نہیں دی جاتی تھی۔ تیسرے دن کہیں جا کے گھانٹی کے گھر گھراہٹ بند ہوئی۔

اللہ توبہ توبہ' سفید کفن میں اینٹھی ہوئی بوا کس قدر ڈراؤنی لگ رہی تھیں۔ کس غضب کی نامرادی اور پھٹکار تھی چہرے پر ادھ کھلی گھومی ہوئی آنکھیں' اودا اودا رنگ' منہ اور ناک سے گلابی گلابی پانی رس رہا تھا برسوں رات کو خوابوں میں آ کے ڈراتی رہیں۔ اندھیرے میں جاتے دم نکلتا کہ بوا نہ کھا جائیں جھٹپٹا ہوتے ہی دم فنا ہونے لگتے۔ کلیاں چننے جانے کی ہمت نہ ہوتی۔ معلوم ہوتا مسجد کے پچھواڑے بیٹھی ہیں برگد کے نیچے کرمچی سلیپر میں سے ریت جھاڑ رہی ہیں۔ اور ابھی ادھر سے ڈھول بجاتی میرٹھ میں ملیں گے دونوں جنے۔" گاتی آ جائیں گی۔

ہائے میاں سے بہت روٹھا کرتی تھیں مگر جب وہ روٹھے تو جگ نے منہ موڑ لیا

بوا کی یہ گت ہوئی اور انہوں نے پلٹ کر نہ دیکھا ہائے نگوڑی بوا لوگ خواب دیکھنے پر بھی پہرا بٹھاتے ہیں جینے کا کوئی سہارا ہوا دنیا کی آنکھوں میں کھلنے لگے گا۔

سارے گھر پر بوا کی موت کی ہیبت بیٹھ گئی سب ہی کے ہاتھوں پر ان کے معصوم خون کے دھبے تھے۔ گھر کو بلاؤں سے پاک رکھنے کے لئے فوراً دو ملاّ ڈیوڑھی پر بٹھا دیئے گئے صبح شام ہل ہل کے سپارے پڑھا کرتے تھے اور بھر بھر باں روٹی ٹھونستے!

بوا کی موت نے قدسیہ خالہ کے پیر اکھاڑ دیئے دو دن تک ان کے منہ میں کھیل تک نہ اڑ کے نہ گئی۔ رات رات بھر دیوانگی کے عالم میں چکر کاٹتیں۔ اندھیرے آنگن میں خاموش سر جھکائے فرش کو گھورا کرتیں جیسے اس میں کوئی سند ڈھونڈ رہی ہوں کہ پا جائیں تو وہیں سما جائیں۔ پیاسی چڑیا جیسی آنکھیں پھاڑے اپنے چاروں طرف مڑ مڑ کر دیکھتی ہیں کہ کوئی خون آشام درندہ جست مار کر گلا نہ دبوچ ڈالے۔ ہر طرف موت منڈلاتی نظر آتی۔ نانی بیوی شربت بنا کے رہتیں یہ چپکے سے آنکھ بچا کے اگالدان میں انڈیل دیتیں۔ پانی مٹھی میں دبا کر جھوٹ موٹ منہ چلانے لگتیں۔ پھر جا کے پاخانے میں پھینک آتیں صرف اماں کی رکابی سے نوالہ لیتیں۔ انہیں کسی پر بھروسہ نہ رہا تھا۔

اس شام شبیر ماموں آئے۔ گھڑی بھر ادھر ادھر چوروں کی طرح دیکھتے رہے بغیر آنکھیں ملائے دیوان غالب کی جلد قدسیہ خالہ کو دی۔ دادی اماں کو سلام کیا پھر اٹھ کر بغیر قدسیہ خالہ پر نظر ڈالے چلے گئے۔ قدسیہ خالہ دونوں ہاتھوں سے کتاب دبوچے ایسی بیٹھی تھیں کہ اگر کھل گئی تو اژدھا نکل کے انہیں ڈکار جائے گا۔ نانی بیوی ان کا بستر ٹھیک کر رہی تھیں بڑے پیار سے تکیہ پر پھول سجا کر انہوں نے دلائی تہہ کر دی۔

"لو بیٹی ذرا کے ذرا لیٹ رہو' تمہارا کھانا ادھر ہی لے آؤں گی ادھر تو خوگیر کی بھری ہوئی ہے انہوں نے برآمدے میں لگے طویل دسترخوان کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے' اماں بولی۔" انہوں نے کتاب تکیہ کے نیچے رکھ دی۔

"کیوں بیٹی..... دوپہر کو بھی منہ جھٹال کے اٹھ گئیں..... اور ....." حالانکہ انہیں گمان بھی نہیں تھا کہ بیٹی ان پر شک کرتی ہے، آخر کو ماں تھیں۔ اکلوتی بچی پر

ہمیشہ ہی جان جاتی تھی اپنی دانست میں وہ جو کچھ کرتی تھیں اس کی بھلائی کے لئے کرتی تھیں۔

ایک دم قدسیہ خالہ کا کلیجہ منہ کو آگیا چچا میاں جھک کر کتاب اٹھا رہے تھے۔

قدسیہ خالہ پر جاڑا بخار کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ایک ننھا سا کاغذ کا پرزہ ہوا میں لرزتا ہوا قدسیہ خالہ کے قدموں میں گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھاتیں چچا میاں نے پیر رکھ دیا جھک کر اٹھایا بغیر کھولے الٹ پلٹ کے دیکھا اور نانی بیوی کی طرف بڑھا دیا۔ قدسیہ حالہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

"کیا ہے؟" انہوں نے پرچہ لے کے دیکھا پھر پھینک دیا۔

"چل ہٹ۔" نانی بیوی کبڈ تھیں ایک حرف نہ پڑھ پائی تھیں۔

"ارے ارے تعویذ ہے بے ادبی نہ کرو۔" انہوں نے پرچہ اٹھا کر قدسیہ خالہ کے تکیہ پر رکھ دیا۔

"کیسا تعویذ؟" وہ ایک دم مودب ہو گئیں۔

"بھوت اتارنے کا۔"

"اونہہ بھئی میں تمہارے ساتھ کی کھیلی تو ہوں نہیں کہ لگے مذاق کرنے۔" نانی بیوی بگڑ کر چلی گئیں۔

"ساتھ کے کھیلے کب گنتی میں لاتے ہیں۔" وہ دبی زبان سے کہتے دادی اماں کے برآمدے میں چلے گئے۔

"اماں بیگم! فتح پور والی زمین میرے نام کر دو نہیں تو امام حسینؓ کی قسم سنی ہو جاؤں گا۔"

"موار کالی مذہب! نانی بیوی بڑبڑائیں۔

"میٹھی والے آموں کے باگ میرے نام جلد کر دو تو ابھی سنی ہوا جاتا ہوں۔" وہ نانی بیوی سے الجھتے۔

"اوئی وہ تو قدسیہ کے نام ہیں۔"

"کوئی مضائقہ نہیں' قدسیہ کو بھی ہبہ کر دو میں سب سے سمجھ لوں گا۔"

"تیرے منہ میں خاک" نانی بیوی جوتی سنبھالتیں اور وہ ممانی کو جلانے لگتے۔

"بھابی یہ کڑے دیدو تو تمہاری ساری سوتوں کی ناک چوٹی کاٹ کے تمہارے

قدموں میں رکھ دوں۔" مگر کوئیا نہیں کچھ نہ دیتا کہ وہ اپنی ساری جائیداد رنڈیوں میں پھونک چکے تھے۔

تہجد کی نماز پڑھنے نانی بیوی اٹھیں تو تیمم کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ جہاں کے تہاں معلق رہ گئے۔ قدسیہ خالہ کی پلنگڑی خالی پڑی تھی تکیہ کے پھول جوں کے توں مہک رہے تھے ایک پتی نہ مسلی تھی۔ صدر دروازہ بھاڑ کی طرح کھلا تھا کنڈی ابھی تک مل رہی تھی۔ نانی بیوی کی چیخیں سن کر جگار ہو گئی وہ کونے کونے میں قدسیہ کو پکارتی پھر رہی تھیں۔ ذرا ہوش ٹھکانے ہوئے تو لالٹینیں لے کر لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

"ارے یہ کیا ہو رہا ہے ہمیں نہ بتاؤ گے لوگو؟" دادی اماں گھگیا کر سب کو بوکھلا رہی تھیں۔ نانی بیوی کو اماں چھوٹی سی بچی کی طرح کندھے سے لگائے دلاسا دے رہی تھیں۔

"مختلف کونوں سے پوچھا جا رہا تھا۔ بچے ٹھنکنے لگے مرغیاں کڑکڑانے لگیں۔

"اَے ہے شاید ڈربہ کھلا رہ گیا۔" نیند میں تائی اماں سمجھیں بلی مرغی لے گئی۔ قدسیہ خالہ کے چھوٹے چھوٹے برہنہ پیروں کے نشان باؤلی مینڈ تک تو ملے پھر ختم ہو گئے۔ دائیں طرف اسٹیشن جانے والی پگڈنڈی پر سینکڑوں مویشیوں اور انسانوں کے نقش قدم نظر آئے مگر ان میں قدسیہ خالہ کے ننھے ننھے سفید پیروں کا ایک بھی نشان نہ تھا۔

"کیوں روتی ہیں۔ وہ جہاں گئی ہے اللہ اسے غریق رحمت کرے۔" چچا نے سوکھے آنسو پوچھے کس قدر ذلیل تھے ہمارے چچا میاں!"

"آمین!" نانی بیوی نے بد بد درود پڑھنا شروع کیا۔

کچھ دن بعد ان کے لئے عجیب عجیب قصے مشہور ہونا شروع ہوئے کہ جب وہ باؤلی میں کود پڑیں تو چھن سے تہہ میں ایک کھڑکی کھلی۔ کیا دیکھتی ہیں لق ودق میدان ہے ہو کا عالم' آدم نہ آدم زاد سامنے سے غبار اٹھتا نظر آیا۔ جب دھند چھٹا تو کیا دیکھتی ہیں کہ ایک تخت زریں ہے کہ زرنگار تکیوں سے آراستہ ہے چار پریاں تخت کے چاروں کھونٹ سنبھالے ادب سے سر جھکائے کھڑی ہیں انہیں تخت پر بٹھایا گیا اور آسمان کی طرف اڑ گیا۔"

یہ قصے چچا میاں گڑھ گڑھ کے سنایا کرتے تھے کچھ بدمذاق لوگ یہ بھی کہتے تھے وہ شبیر ماموں کے ساتھ بھاگ گئیں۔ کچھ بھی ہو قدسیہ خالہ کا نام لینا اس دن گناہ وہ گیا جب تک نانی بیوی زندہ رہیں ان کے ڈر سے کوئی ذکر نہ کرتا پھر سب بھول بھال گئے کہ بھول جانے میں بڑے فائدے ہیں ضمیر ملامت نہیں کرتا۔

کوئی ڈھائی مہینے ہوئے ایک ٹیلی فون آیا۔

"میں رفیعہ حسن بول رہی ہوں۔ وکٹوریہ ٹرمینس کے مسافر خانہ سے بول رہی ہوں' صبح کے پلین سے لندن جا رہی ہوں کچھ وقت دے سکیں تو....." وہ پی ایچ ڈی کرنے جا رہی تھی بڑی آلکس آئی کوئی ادب نواز ہو گی خواہ وہی گھسے پٹے جملے دہرا کر جی جلائے گی۔

بڑے ادیب نئی پود کو ابھرنے نہیں دیتے گٹھ بنائے بیٹھے ہیں بس ایک دوسرے کو اچھالتے ہیں مجھے موقع پرست اور جانبدار ثابت کرے گی۔

"دراصل..... میں کوئی ان گڑھ سا بہانہ سوچنے لگی۔

"میں زیادہ وقت نہیں لوں گی بس دس منٹ کافی ہوں گے۔" وہ بڑی ہوشیار معلوم ہو رہی تھی۔

وہ آئی تو بڑے پیار سے مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی اسے دیکھ کر آپ ہی آپ جی ہلکا ہو گیا۔

"آپ کا پتہ بڑی مشکل سے ہاتھ آیا آپ کو تو شاید یاد نہ ہو آپ میری رشتہ کی بہن لگتی ہیں میری امی قدسیہ شبیر حسن آپ کی خالہ ہوتی ہیں۔"

-قدسیہ خالہ..... تم قدسیہ خالہ اور شبیر ماموں کی لڑکی ہو۔

میں احمقوں کی طرح ہکلانے لگی۔ میرٹھ میں ملیں گے دونوں جنے!" بوا کی رسیلی آواز میری یادداشت کے پٹ جھنجھوڑنے لگی تو دونوں مل ہی گئے 'بعض انسان مر کے دوسروں کو جینے کا سلیقہ سکھا جاتے ہیں!

"اوہ عین وقت پر امی کی ہمت جواب دے گئی ابو سے لڑ پڑیں کہ مجھے گمراہ کر کے گناہگار کر رہے ہو مگر مستقیم ماموں....."

"مچھو چچا میاں!" جنت تو کیا نصیب ہو گی مرحوم کو مگر خیر اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ امی کی تو انہیں دیکھ کر جان ہی نکل گئی..... وہ تو باولی میں کود کر جان دینے جا

رہی تھیں مگر مجھو ماموں نے کہا یہ جوتے چھوڑ کر ننگے پیر آ گئیں یہ تو پہنتی جاؤ نہیں تو پاؤں بھیگ گئے تو زکام ہو جائے گا۔

"چچا میاں نے کہا؟"

"ہاں اور جیب سے امی کی جوتیاں نکال کر دیں مگر امی بکھری جاتی تھیں کہ مجھے مرجانے دو۔" "مگر ان کے پیروں کے نشان؟"

"وہ کیسے ملتے ابو نے انہیں اٹھا لیا۔" وہ ہنس پڑی اب تو امی اتنی موٹی ہو گئی ہیں کہ سوچ کے ہنسی آتی ہے وہاں سے پیدل اسٹیشن گئے۔"

"اور وہاں سے میرٹھ! بوا کی یاد بہت ستانے لگی۔"

"میرٹھ؟ نہیں تو..... وہاں سے اپنے دوست کے ہاں رودلی گئے۔"

"رودلی؟ میاں کی سسرال؟ خوب!"

"کس کی سسرال؟" وہ چکرائی۔

"پھر؟" میں نے بات ٹالی۔

"ان کے دوست ابرار چچا وکیل تھے طلاق لینے کی بہت کوشش کی۔" مرتے مر جاؤں گا مگر طلاق نہیں دوں گا وہ کہا کرتے تھے۔

"جی ہاں اور ستم ظریفی تو دیکھئے مرے بھی نہیں۔"

"کیا فرق پڑا" وہ زندہ ہی کب تھے؟

"واقعی کوئی فرق نہیں پڑا۔"

جب طلاق کی کوئی صورت نہ نظر آئی تو شبیر ماموں کے دوست نے رائے دی کہ اگر قدسیہ عیسائی ہو جائیں تو طلاق ہو سکتی ہے کانپور کے ایک پادری سے رجوع کیا گیا مگر جب اسے تبدیلی مذہب کی وجہ بتائی گئی تو بہت باوختہ ہوا نیز یہ کہ اگر یہ پھر دوبارہ مذہب اسلام اختیار کیا تو طلاق باطل ہو جائے گی۔

مجھو ماموں کو جب اس ہیر پھیر کی خبر ملی تو آ کر بہت دند مچایا۔ سب کو قتل کر کے قدسیہ کو لے بھاگنے کی دھمکیاں دیں۔ شبیر ماموں کی مرمت کرنے کی دھمکیاں دیں اسی شام ایک قاضی کو بلا کر نکاح کر دیا۔

"یہ نکاح نہیں ہوا" شبیر حسن کے دوست ابرار نے کہا وہ وکیل تھے۔

"ہوا کیسے نہیں" وہ ابرار چچا کی گردن توڑنے پر مصر تھے۔

اگر قدسیہ خالہ کے شوہر کو پتہ چل جاتا تو پولیس دونوں کو حرام کاری کے جرم میں دھر لیتی۔ قدسیہ خالہ اور شبیر ماموں ساری عمر چوروں کی طرح چھپتے رہے معمولی سے عام انسان ویسے ہی گمنام رہتے ہیں پھر بھی خوف تو رہتا تھا حالانکہ چچا میاں نے انہیں یقین دلا رکھا تھا کہ اگر اس نے کچھ گڑبڑ کی تو اس کا قصہ ہی پاک کر دیں گے۔ "اور خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی؟" قدسیہ خالہ کہا کرتی تھیں۔

"وہاں تم پچھاڑ کھا کی ایک کونے میں بے ہوش ہو جانا میں سب سمجھ لوں گا۔" چچا تسلی دیتے۔

"پھر جب طلاق بل پاس ہوا تو وہ برٹش نیشنلٹی لے کر انگلستان جا رہے تھے دوسرے میں سیانی ہو چکی تھی پھر نئے سرے سے ہنگامہ کھڑا کرنے کی ضرورت نہ محسوس ہوئی۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ امی اور ابو کی محبت کو دیکھ کر شادی بیاہ اور طلاق کی اہمیت پر ہنسی آنے لگتی ہے شاید اس لئے کہ میں نورمل نہیں۔"

یہ کیسے جانا کہ تم نورمل نہیں!"

"میں سمجھتی ہوں کہ جو امی اور ابو نے کیا وہی کرنا چاہئے تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ان کی محبت کا پھل ہوں۔"

وہ صرف دس منٹ کے لئے آئی تھی مگر نہ جانے مجھے رخصت کرنے کا خیال آیا نہ اسے جانے کا چند گھنٹے پہلے مجھے اس کے وجود کا بھی یقین نہیں تھا وہ میرے لئے ایک اجنبی تھی کھانے کے بعد ہم بہت رات تک دو بچوں کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے میرین ڈرائیو کے کنارے ٹہلتے رہے۔ ایک مہکتا ہوا پھول تھا جو ہمارے درمیان کھلتا رہا پروان چڑھتا رہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔" ہم دونوں ایک ہی بات محسوس کر رہے تھے۔

کبھی زندگی کا ایک لمحہ صدیوں پر بھاری پڑ جاتا ہے۔

امی کو اتنا دکھ کس بات کی سزا کے طور پر ملا؟ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔

"اور بوا کو بالے میاں سے کیوں جدا کر دیا؟"

"کسی کے خواب چھین کر انہیں کچلنے میں کیا ملتا ہے؟"

"کیونکہ اس کی اپنی بانجھ دنیا میں خواب نہیں ہوتے۔"

"اس لئے وہ دوسروں کا خون کرتا ہے؟ کیوں؟"

احساس کمتری سے پیچھا چھڑانے کے لئے تو چیخ چیخ کر کہتا ہے۔

میرا ملک عظیم ہے میرا مذہب سب سے ارفع ہے' میرا شہر۔ میرا گھر۔۔۔۔ میری دنیا زیادہ بلند ہے زیادہ مقدس ہے میرا شعو میرا یقین میرا طریقہ فکر صحیح ہے۔" "مگر زبردستی۔"

"ہاں زبردستی وہ جو خیال اور عمل کی آزادی کو ہر انسان کا حق سمجھتے ہیں ڈیموکریسی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں تلوار کے زور سے ڈیموکریسی حلق میں ٹھونسنے لگتے ہیں کبھی خدا کا حکم کہہ کر کبھی کسی اصول یا جذبہ کی آڑ لے کر اور کبھی رسم و رواج کے بہانے اور کچھ نہ ملے تو بھوت پریت کے سر الزام تھوپ دیتے ہیں۔

صبح جب میں اسے ائرپورٹ پر جدا کرنے گئی تو ہوائی جہاز میں داخل ہونے سے پہلے وہ بڑی دیر تک مجھ سے خاموش لپٹی کھڑی رہی جیسے وہ کوئی پیغام میرے جسم میں چھوڑ جانا چاہتی ہے۔

"بس ایک دعا ہے۔" اس نے اناؤنسر کی آواز پر مڑتے ہوئے کہا۔

"کہ ہمیں بھی کوئی ایسی لگن سے چاہے جیسے ابو نے امی کو چاہا۔۔۔۔ اور۔۔۔۔" اس نے تکلف سے آنکھیں نیچے گرا دیں۔

"اور۔۔۔؟" میں نے اسے آخری پھاٹک کی سیڑھیوں پر روک کر پوچھا۔ یہ چلی گئی تو میں یہ ادھوری بات کی خلش لئے رہ جاؤں گی۔

"جیسے مچھو ماموں نے محبت نباہی۔"

"مچھو چچا میاں؟ مستقیم چچا وہ ٹیڑھے میڑھے مستقیم زمانے بھر کے رنڈی باز خدائی خار شرابی' لچے' جو خاندان کی دمکتی ہوئی بلند پیشانی پر گھناؤنا پھوڑا تھے جنہیں کسی خاندانی لڑکی نے اپنا میلا آنچل تک نہ چھونے دیا۔ انہوں نے قدسیہ خالہ کو چاہا۔۔۔ ایسے کہ آج قدسیہ کی بیٹی ان جیسے محبوب کا ارمان دل میں بسائی ہو۔"

"مگر وہ جانتے تھے کہ ابو کے سوا امی کسی اور کو گنتی میں نہیں لاتیں۔ ابو بیچارے تو پس پسے تھے۔" وہ زور سے ہنسے ساری اسکیم مچھو ماموں کی تھی۔

وہ چلی گئی ایک دم بڑا سخت تنہائی کا احساس چاروں طرف سے گھیر لے گا۔

"مچھو چچا!" میں نے دل ہی دل میں کہا سنا تم نے اس وقت تمہاری قبر میں جگنو ہی جگنو جگمگا رہے ہوں گے۔

انسان ایک دوسرے کو پہچاننے کا گر کب سیکھیں گے؟

جہاز ایک بدزاج دیو کی طرح لرزا گرجا اور آسمان کی بلندیوں کی طرف اڑ گیا۔

"جاؤ رفیعہ جسن تم بے دھڑک جہاں چاہو جا سکتی ہو زندگی کی قدروں کو ناپنے تولنے کے لئے تمہارا فیتہ ہے اپنے ہاتھ ہیں اپنی ترازو ہے۔ تمہاری زندگی میں کوئی ڈنڈی نہ مار سکے گا۔ تمہارے خواب کبھی چکنا چور نہ ہوں گے۔"